مفکّرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندویؒ کی عظمت ومقبولیت کا راز

مع

خطبۂ صدارت

بہ موقع: بارھواں اجلاس مسلم پرسنل لا بورڈ بہ مقام: احمد آباد

ازقلم

مرشد العلما حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

تفصیلات

کتاب کا نام: مولانا ابوالحسن علی میاں صاحبؒ کی عظمت ومقبولیت کا راز مع خطبۂ صدارت

ازقلم: ....حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صفحات: ۸۰

سن اشاعت: ....اپریل ۲۰۱۲ء

تعداد: ۱۰۰۰

ناشر: ....ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

99133,19190 - 99048,86188

ملنے کا پتہ

مفتی سلیمان صاحب شاہوی (دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر)

(99050,60234)

فہرست

پیش لفظ

از: مفتی عبدالقیوم راجکوٹی (دارالافتاء جامعہ ڈابھیل)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ (م ۲۰۰۰ء) کی شخصیت علم و فضل، تقویٰ و اِنابت، تدبُّر وفِراست اور دعوتِ دین کے لحاظ سے ہمہ گیر حیثیت کی حامل تھی۔ سنتُ اللہ یہی رہی ہے کہ قصرِ اسلام کی حفاظت ظاہری طاقت کے بل بوتے پر نہیں؛ بلکہ ایسے خدا مست اور بے تاج وکُلاہ داعیوں کے دم قدم سے ہوتی ہے جو زر و جواہر کی چمک دَمک سے بے نیاز اور جاہ و منصب کے تنگ خول سے آزاد ہوکر دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی جامع صفات شخصیت نے جس قرینے سے آدابِ دعوت کے تقاضے پورے کیے، وہ پوری اُمَّت کے لیے قابلِ تقلید مثالی نمونہ ہے۔ حضرت مولانا کی پُرتاثیر اور پُرکشش شخصیت ہی کی کشش تھی کہ، دوریوں کے صحراء اور فاصلوں کے جنگل حائل ہونے کے باوجود دنیا بھر کے مسلمان اُن پر زندگی میں بھی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے رہے، اور اِس عالمِ فانی سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی اُن کی محبت لوگوں کی دلوں کی دھڑکن ہے۔

مولانا کے وصال کے بعد ۳۰؍جولائی ۲۰۰۰ء ڈیوز بری برطانیہ میں M.C.F. (مسلم کمیونٹی فارم) کے ذمَّے داروں نے ایک مثالی سمپوزیم منعقد کیا، جس میں برطانیہ کے سرآوُردہ اہلِ علم کے عِلاوہ دیگر ممالک کے بہت سے اصحابِ فضل و کمال مندوبین بھی شریک ہوئے اور مقالات پیش کیے۔

اِس سمپوزیم میں شرکت کرنے والے بعض حضرات کے اسمائے گرامی حسبِ

ذیل ہیں:

(۱) شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی صاحب
(۲) قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب
(۳) مولانا تقی الدین ندوی صاحب
(۴) مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب
(۵) مولانا سید سلمان الحسینی ندوی صاحب
(۶) مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب
(۷) مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب
(۸) شیخ نادر عبدالعزیز النوری صاحب
(۹) ڈاکٹر مزمل صدیقی صاحب
(۱۰) مفتی زبیر بھیات افریقی صاحب
(۱۱) مولانا عیسیٰ منصوری صاحب

مذکورہ حضرات نے مولانا علی میاںؒ کی داعیانہ زندگی کے جن اہم اور بنیادی عناصر پر روشنی ڈالی، اربابِ دین ودانش کے لیے جو چشم کُشا حقائق بیان کیے اور جس معتدِل راہِ عمل کی نشان دہی کی، وہ دین اور علمِ دین سے وابَستہ اَفراد کے لیے یقیناً سرمایۂ بصیرت ہی نہیں، سرمایۂ حیات ہے۔ بیانات ومقالات کے چند اہم اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

بیانات ومقالات کے اقتباسات

(۱) حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ مولانا علی میاں کو مخاطَب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(ا) آپ کے آنے سے میری کُٹیا (خانقاہ) ایسی روشن ہوگئی جیسے شمس تبریزؒ کے آنے سے مولانا رومیؒ کے آستانے پر بَہار آ گئی۔ (مولانا عیسیٰ منصوری)

(۲) مولانا نے ایک ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' اپنے قلم سے لکھی اور ایک دوسری ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' اپنے عمل سے لکھی۔ (مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(۳) مولانا مرحوم نے کویت آ کر اہلِ کویت کو جگایا، اور ''ماذا خسر العالم''

سے پورے عربی ممالک کو متنبّہ کیا۔ (شیخ نادر عبد العزیز نوری کویت)

(۴) مولانا کو اللہ تعالیٰ نے اِس اُمّت کی اِصلاح کے لیے پیدا فرمایا تھا، اور اِس کے مواقع عنایت فرمائے۔ مولانا مرحومؒ فرماتے تھے: مَیں حضرت رائے پوریؒ کی تین صفات سے بہت متأثّر ہوا: فنائیت، اعتدال اور شفقت۔ حضرت مولانا علی میاںؒ میں بھی یہ تینوں صفتیں بدرجۂ کمال واَتم تھیں۔

مولانا کے تقویٰ کا یہ عالَم تھا کہ، سیرت پر عربوں کے سامنے اپنے بیان میں ایک جملہ ''عالمِ عربی کی رُوح محمد عربی ہیں'' فرمایا، سارے عرب رونے لگے؛ حالاں کہ اہلِ عرب جلدی روتے نہیں۔ مولانا کا مقام کیا تھا؟ اِس کا اندازہ اِس سے لگایئے کہ، شیخ عبد الحلیم اور شیخ ابوزہرہ سے ایک کتاب پر مقدَّمے کی درخواست کی، تو فرمایا کہ: علی میاں کے مقدَّمے کے بعد کسی کے لیے مقدَّمہ لکھنا جائز نہیں۔ (مولانا تقی الدین ندوی)

(۵) مولانا مرحوم اِس صدی کے اعلیٰ ترین مجدِّ دین میں سے ایک تھے، پورے عالَمِ اسلام کی ہمدردی اُنھیں تھی، خاص کر عربوں کو دِینی ذمّے داری کا احساس دِلانا مولانا کا خاص مشغلہ تھا۔ (ڈاکٹر مزمل صدیقی)

(۶) مولانا میں تواضع، ہمدردی، محبت کی صفات جو تھی وہ مشکل سے ملے گی، مَیں ''سمرقند'' کے سفر میں مولانا کے ساتھ تھا، امام بخاریؒ کے مزار پر مرحوم نے بڑی رِقّت سے رو رو کر بیان فرمایا، اور یہ پیغام پہنچایا کہ، امام بخاریؒ کی حدیثی خدمت تو تھی ہی؛ مگر مسلمانوں کے سخت وقت میں ایک مجاہد بھی بن کر سامنے آئے۔

مولانا نے ''آکسفورڈ یونیورسٹی'' میں ''اِسلامک سینٹر'' کی بِنا ڈال کر مغرب کی وادی میں پہلی اذان دی ہے، اِس سینٹر سے ہمیں کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔ (ڈاکٹر مناظر اَحسن)

(۷) مولانا کا ملفوظ نقل فرمایا کہ: ''عُلما کو تین چیزیں اَپنانی چاہیے: اخلاص، اختصاص اور استقامت۔ (مفتی زبیر بھیات)

(۸) مولانا علی میاں زندہ تھے تو مقبول ومحبوب تھے، اور موت کے بعد مقبول تر محبوب تر ہو گئے۔ مولانا نے سخت سخت بات ہمیشہ میٹھے سے میٹھے لہجے میں کہی ہے۔ شاہ بانو کیس میں میڈیا ہمارا سخت مخالف تھا، مولانا مرحومؒ نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایک شعر ذرا ترمیم سے اُن کے سامنے پڑھا، اِس شعر نے سارے میڈیا کا رنگ بدل دیا۔

آہستہ خرام، بلکہ مخرام		زیر قدمت ہزار جان است

آہستہ چلو؛ بلکہ چلو ہی مت؛ اِس لیے کہ تیرے قدموں کے نیچے ہزار ہا جانیں ہیں۔

مولانا نے اِس کو بدل کر یوں پڑھا:

آہستہ خرام بلکہ مخرام		زیر قلمت ہزار جان است

آہستہ چلو؛ بلکہ چلو ہی مت؛ اِس لیے کہ تیری حکومت کے نیچے ہزار ہا جانیں ہیں۔ (قاضی مجاہد الاسلامؒ)

(۹) مولانا مرحوم کے متعلِّق شیخ علی طنطاوی نے فرمایا کہ: اگر کسی شخص کو قلعہ تعمیر کرنے یا کسی لشکر کی قِیادت کے سبب عظیم شمار کیا جاتا ہے، تو ابوالحسن نے اپنے تلامذہ کے دلوں میں پتھروں کے قلعوں سے زیادہ مضبوط اور محکم اسلامی قلعے تعمیر کیے ہیں، اُنھوں نے عُلَما، صُلَحا اور دُعاۃِ مُخلِصین کی ایک خاص جماعت تیار کر دی ہے۔ (مولانا عبداللہ کاپودروی)

(۱۰) مولانا علی میاں کی ایک عظیم خوبی یہ بھی تھی کہ، اُن کا ظاہر و باطن ایک سا تھا، وہ جو کہتے تھے، لکھتے تھے، وہی کرتے بھی تھے۔ اُن کے ہاں فکر و عمل کے تضاد کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ (الحاج عبدالستار)

(۱۱) الحاج عبد الستار کے مختصر مقالے کے بعد حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم نے اپنے تفصیلی مقالہ (جو آگے مِن وعَن آرہا ہے) کو بہت ہی مختصر کر کے سنایا، آپ کے مقالہ کا عنوان تھا ''مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحبؒ کی عظمت ومقبولیت کا راز''۔ اِس مقالے میں حضرت مولاناؒ کی زندگی کے کئی قابلِ تقلید اوصاف کا ذکر ہے۔ایک جگہ مرحوم کے اوصاف کا تذکرہ فرماتے ہوئے کتنی عمدہ بات تحریر فرمائی:

''تفسیر خازن'' میں راسخ فی العلم کی چار علامات بتلائی گئی ہیں: اپنے اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تقویٰ، اور اپنے اور لوگوں کے معاملے میں تواضع، اور اپنے اور دنیا کے معاملے میں زُہد و بے رغبتی، اور اپنے اور اپنے نفس کے معاملے میں مجاہدہ''۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی میں یہ چاروں اوصاف علی وجہ الاتم نظر آتے ہیں، اور اِن ہی اوصاف نے آپ کو شہرت اور مقبولیت اور عظمت ومحبوبیت کے بامِ عروج پر پہنچایا۔

(۱۲) اگر حضرتؒ آج اِس محفل میں ہوتے تو بے چین ہوتے کہ، کس طرح میں اِس مجمع کو دعوت دوں اور اسلام کی دعوت اِن کے سینے میں اُتاروں؟ حضرتؒ نے اُمَّتِ مسلمہ کو ہمیشہ اِتحاد کا پیغام دیا، اور خود مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعے ہندوستان کے ہر مکتبِ فکر کو ایسا جمع فرمایا کہ، حکومت اور پوری ہندو لابی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا، اور لوگوں نے دیکھا کہ، ایک درویش کی آواز میں اللہ تعالیٰ نے کیسی قوّت اور تاثیر رکھی ہے۔ (مولانا سلمان ندوی)

(مأخوذ از ماہنامہ ''اذان بلال'' دسمبر ۲۰۰۰ء، جنوری ۲۰۰۱ء، مضمون نگار: مولانا مرغوب احمد لاجپوری زید مجدہم)

چار اہم نکات

(از: مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ)

سمپوزیم کی آخری نشست میں اختتامی خطاب شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی

عثمانی دامت برکاتہم کا ہوا، اور آپ ہی کی دعا پر جلسے کا اختتام ہوا۔

مولانا نے اپنے پُر مغز اور فکر انگیز خطاب میں چند اہم نکات پر روشنی ڈالی جس کا خلاصۃ الخلاصہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) دنیا میں بڑی قد آور شخصیات آتی رہتی ہیں اور رخصت بھی ہوتی رہتی ہیں؛ لیکن ایسی ہستیاں خال خال وجود میں آتی ہیں جو اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ کی طرف سے ﴿وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي﴾ کی مظہر ہوں، جن کی محبت عالَمِ اسلام کے ہر گوشے میں، ہر طبقۂ خیال میں اور ہر مسلمان کے شیشۂ دل میں اِس طرح رچی اور بسی ہوئی ہو کہ، جیسے کسی عزیز ترین اور مشفِق باپ کی محبت انسان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، ایسی شخصیتیں دنیا میں بہت کم ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

میرے والد ماجد (حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ) اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ملاقاتیں بہت کم ہوئیں؛ لیکن کبھی حضرت مولانا کا ذکر آتا تو والد ماجدؒ ضرور یہ لفظ ارشاد فرماتے کہ: ''وہ مُوَفَّق مِن اللہ ہیں''۔

مولانا کی زندگی اور تعلیمات کے چند نکات عرض کرنا چاہتا ہوں:

پہلا نکتہ:

حضرت مولانا قُدِّسَ سِرُّہٗ (اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے) کو اللہ تعالیٰ نے ایسا علم عطا فرمایا تھا جس میں علم کی رُوح: خشیت، اِنابت، تواضع، سادگی، عمل، تقویٰ اور اُمَّت کے لیے تڑپنے کی اُمنگ پوری توانائی کے ساتھ جَلوہ گَر تھی، آج چاردانگِ عالَم میں حضرت مولانا کا جو فیض پھیلا ہوا نظر آتا ہے اِس کا ذریعہ تنہا حروف ونقوش کا علم نہیں ہے؛ بلکہ یہ اثر پذیری اور قبولیت درحقیقت اُس سوزِ دَرُوں اور گُدازِ قلب کا نتیجہ ہے جو

رات کی تنہائیوں میں اپنے مالک کے سامنے گڑگڑانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو عطا فرمائی تھی، اور یہ دولت اللہ والوں کی نیاز مندانہ صحبت ومَعیَّت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے علوم حاصل کرنے کے بعد اصلاحِ نفس اور تزکیۂ باطن کے لیے وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ جیسے بزرگانِ دین اور اکابر اولیاء اللہ کی خدمات میں طالبِ علم کی حیثیت سے حاضر ہوئے، اور اُن سے مسلسل اِکتسابِ فیض کرتے رہے، جس کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے علم کو ایسا صَیقل کیا اور ایسی جِلا بخشی کہ، اُس کی روشنی سے سارا عالَم جگمگا اُٹھا۔ اِس لیے حضرت مولانا کی حیاتِ طیبہ سے ہمیں پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ: حروف و نقوش پر اِترانے اور علم پر گھمنڈ کرنے کے بہ جائے مجاہدۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لیے کسی اللہ والے کے پاس جانا چاہیے، جب وہ اللہ والا علم کو صَیقل کرتا ہے اور اسے جِلا بخشتا ہے، تب اللہ تعالیٰ ایسے علم کی خوشبو سے ساری دنیا کو مُعطَّر کر دیتا ہے۔ یہ پہلا سبق ہے جو ہمیں حضرت مولانا کی زندگی سے حاصل ہوا، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑے کام کی بات ہے کہ، حصولِ علم کے ساتھ اگر کسی اللہ والے سے تعلُّق قائم کر کے نفس اور باطن کا تزکیہ نہ کیا جائے، تو علم میں برکت نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے تصوُّف وطریقت کا بھی امام بنایا تھا، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ حضرت مولانا اپنے علمِ طریقت کو لے کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتے، اور عالَمِ اسلام کے سُلگتے ہوئے مسائل سے چشم پوشی فرما لیتے؛ لیکن حضرت مولاناؒ نے یہ انداز اختیار نہیں فرمایا، اُن کے دل میں اُمَّت مسلمہ کا دَرد موجزن تھا، اُن کے دل

میں ایک ایسی آگ سُلگی ہوئی تھی جو اُنھیں یہ سوچنے اور اِس بات پر غور وفکر کرنے پر مجبور کرتی کہ، اُمَّتِ محمدیہ —عَلیٰ صَاحِبِهَا الصَّلاَةُ وَالتَّسلِيمُ— کی صَلاح وفَلاح کا کیا راستہ ہوسکتا ہے؟ اِس فکر اور جامعیَّت کا نتیجہ ہے کہ، حضرت مولاناؒ اُمَّت کے اجتماعی مسائل کی طرف ہمہ تن متوجَّہ رہتے تھے، اور پیری مریدی کا جو عام تصوُّر رہے اُن کا عملی میدان اِس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔

ایک استفسار پر مولانا کا حکیمانہ مشورہ

مَیں اپنے ذاتی معاملات میں حضرت مولانا سے کبھی کبھی مشورہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے: جب مَیں پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کا رُکن تھا، اور حالات کچھ ایسے پیش آرہے تھے کہ کونسل میں میری طبیعت مطمئن نہیں تھی، مَیں نے اپنے یہ حالات ذکر کر کے حضرت مولاناؒ کو تحریراً مُطَّلع کیا، اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ: ’’اِس موہُوم اُمید پر کہ کونسل کے ذریعے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نِفاذ کی کوشش میں میرا بھی کچھ حصہ لگ جائے، مَیں نے اپنے لکھنے پڑھنے کے کام کا ابھی تک بہت نقصان کیا‘‘۔ اِس پر حضرت مولاناؒ نے اپنے جواب میں لکھا کہ: مَیں تمھیں کونسل سے علاحدگی کرنے کا مشورہ نہیں دیتا، تم بہ دستور یہ کام جاری رکھو، پھر معروف صوفی وبزرگ حضرت خواجہ عُبید اللہ احرارؒ کا یہ مَقُولہ لکھا کہ:

اگر شیخی کنم ہیچ پیرے درد نیا مُریدے نیابد		ولیکن مرا کارِ دِگر فرمودہ اَند

یعنی اگر مَیں پیری شروع کردوں اور پیر بن کے بیٹھ جاؤں، تو شاید دنیا میں کسی کو کوئی مرید نہ ملے؛ لیکن مجھے تو اللہ تعالیٰ نے کسی اَور کام کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ: ’’کارِ دِگر‘‘ یہی مطلب تھا کہ، حکمرانوں کو صحیح اسلامی شریعت کی طرف لانے کی مُخلِصانہ

کوشش کی جائے۔

دوسرا نکتہ: مولانا ندویؒ کا گروہ بندیوں سے اجتناب

اللہ جل جلالہ نے جن سعید رُوحوں کو اِس حقیقت کا اعتراف اور سمجھ عطا فرمائی ہے، اُن میں حضرت مولاناؒ کا نامِ نامی سرِ فہرست ہے، کوئی گروہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ: وہ صرف ہمارے تھے، اور ہر گروہ یہ کہتا ہے کہ: وہ ہم میں سے تھے۔ یہ اِس لیے کہ حضرت مولاناؒ اِس حقیقت سے آشنا تھے کہ، سب کی منزل اللہ جل جلالہ کی رَضا ہے، اُس رَضا کے حصول کے راستے مختلف ہو سکتے ہیں، اگر کسی نے ایک راستہ اختیار کیا تو وہ میرا ہی ہے، کسی نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو وہ بھی میرا ہی ہے، محض اِس وجہ سے کہ کسی نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا مَیں اُسے پَرایا نہیں کہہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ، اُن کی ہمدردی، محبت اور تعاوُن ہر ایک سے تھا، اور کسی ایک گروہ سے باضابطہ تعلُّق ایسا نہیں تھا کہ دوسروں کو وہ غیر سمجھنے لگ گئے ہوں۔ یہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی عمر بھر کا طریقہ رہا، وقتی طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بھی بنے، اور اِس کے تحت عظیم خدمات بھی انجام دیں؛ لیکن مستقل طور پر کسی ایک جماعت سے وابستہ کر کے اپنے آپ کو دوسری جماعتوں سے کاٹ لینے کا طریقہ حضرت مولاناؒ نے کبھی نہیں اَپنایا۔ اِسی کی برکت ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو ہر طبقے میں مقبولیت عطا فرمائی، اور اِسی ہمہ گیری کی صفت اور وُسعتِ قلبی کا اثر ہے کہ، جب کبھی مسلمانوں میں کوئی اختلاف رُونما ہوتا یا نِزاع پیدا ہوتا، تو حضرت مولاناؒ کا دردمند دل اُس سے متأثّر ہوتا، اور ایسے اختلاف کے موقع پر صلح صفائی کے لیے جن مقبول شخصیات کے نام لیے جاتے تھے اُن میں حضرت مولاناؒ کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہوتا؛ کیوں کہ مولاناؒ کی ذات ایسی تھی کہ، اختلافات دُور کرنے اور مختلف حلقوں کے درمیان

مُصالحت کرانے میں اُس سے مدد لی جاسکتی تھی؛ مگر آج قحط الرجال کا عالَم یہ ہے کہ، مَیں وہی جملہ عرض کروں گا جو خود مولاناؒ نے معمولی تصرُّف کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا: "ردة ولا أبابكر لها"، آج مَیں یہ فِقرہ اپنی اصل صورت میں دُہراتا ہوں کہ: "قضية ولا أبا حسن لها"۔

تیسرا نکتہ:

تیسری بات یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کی ذات میں حق گوئی و بے باکی کے ساتھ حکمت وخیر خواہی کو جمع فرمایا تھا، اور اِن دونوں باتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اِمتزاج پیدا کرنے اور توازن واعتدال برقرار رکھنے کا عجیب وغریب سلیقہ بخشا تھا۔ ایک طرف یہ بات کہ جہاں کلمۂ حق کہنا ضروری ہو وہاں کلمۂ حق کہنا ہے، دوسری طرف اُس کلمۂ حق کے ذریعے کوئی فتنہ بھی پیدا نہیں کرنا۔ آپ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تقریر یا تحریر کا مطالعہ کر لیجیے، یہ تینوں باتیں ایسی نمایاں نظر آئیں گی کہ شاید ہی کہیں اَور نظر آئیں، اللہ تعالیٰ نے اُنھیں حق بات حق نیت کے ساتھ حق طریقے کے مطابق کہنے اور لکھنے کی توفیقِ خاص عطا فرمائی تھی۔

چوتھا نکتہ:

جو اِس مختصر وقت میں آپ حضرات سے بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو جس سلامتِ فکری اور دُھلے ہوئے پاکیزہ خیالات سے نوازا تھا، اُس کا ایک مظہر یہ ہے کہ، ساری دنیا جانتی ہے کہ حضرت مولاناؒ عصرِ حاضر میں ایک عظیم داعیٔ دین اور مُصلح بن کر اُبھرے۔ ماضی قریب میں آپ داعیوں اور مصلحین کی فہرست پر اگر نظر ڈال کر دیکھیں، تو بہت سے لوگوں میں یہ بات نظر آئے گی کہ وہ ایک طوفانی جھونکے

کی طرح اچانک اُبھرے، بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا دیوانہ ومُسخَّر کرلیا؛ لیکن اِس اچانک تسخیر کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ عام، جمہور اُمَّت سے ہٹ کر ایک نیا فرقہ اور طبقہ وجود میں آ گیا، ماضی قریب میں آپ کو اِس کی ایک سے زیادہ مثالیں ملیں گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے درجات بلند فرمائے، اُن کے بارے میں کوئی شخص اِس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ماضی قریب میں اُن کا نام داعیانِ حق میں سرِ فہرست تھا، اور اُنھوں نے جو دعوت دی وہ ہمہ گیر اور انقلابی دعوت تھی۔ الحمد للہ اُس دعوت نے عرب وعجم پر اپنے گہرے اثرات مرتَّب کیے؛ لیکن حضرت مولاناؒ نے اپنی دعوت کو کسی بھی مرحلے پر کسی ایسے نظریے سے وابستہ نہیں کیا جو جمہور علُمائے اُمَّت سے ہٹا ہوا ہو، وہ ہمیشہ جمہور اُمَّت کے راستے پر گامزن رہے۔ (مأخوذ از ماہنامہ البلاغ کراچی شعبان ۱۴۲۱ھ)

ہم اگر اُن کی حیاتِ طیِّبہ سے اِستفادہ کرنا چاہیں تو اِن اہم نِکات کو حرزِ جان بنانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِن نکات پر عمل پیرا ہونے اور حضرت مولانا کے مِشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (مولانا محمد تقی عثمانی)

مفکّرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اور حضرت اقدس مفتی احمد صاحب مدظلہ کے مابین مراسم

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کو اپنے دَور کے تمام اکابر سے عقیدت ومحبت کا تعلُّق رہا ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی میاںؒ سے عقیدت کا پہلا سبب اُن کی مؤثّر اور دل آویز تصانیف ہیں۔ مفتی صاحب نے جب سے لکھنا پڑھنا سیکھا اُسی وقت سے مولانا کی کئی تصانیف کا بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ فرمانا شروع کر دیا تھا؛ لیکن ایک ایسی تقریب پیش آئی جس نے مفتی صاحب کو حضرت کی خدمت میں

عریضہ تحریر کرنے پر مجبور کردیا، اور وہ یہ کہ حضرت کی تصنیف ''دستورِ حیات'' کا مطالعہ فرمایا، مطالعہ کر کے بڑے متأثر ہوئے اور اپنے دلی جذبات وتأثُّرات قرطاسِ قلم پر بہ ایں الفاظ ظاہر کردیے:

باسمہ تعالیٰ

ازاحمد خانپوری

مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

مخدومنا المحترم حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم و رحمة الله و برکاته

خدا کرے آپ بہ عافیت وسلامت ہوں۔ احقر اپنے دَورِ طُفولیت سے ہی حضرت والا کی تصانیف کا گرویدہ اور شوقین ہے، خصوصاً سیرتِ سید احمد شہیدؒ اور تاریخِ دعوت و عزیمت، سوانح حضرت مولانا محمد الیاسؒ، سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ وغیرہ کتابیں بار بار پڑھتا ہوں، اور آج بھی اُن کا مطالعہ تازگی بخش ثابت ہوتا ہے۔ آج ہی حضرتِ والا کی تازہ تصنیف ''دستورِ حیات'' ایک دوست کے پاس دیکھی، کتاب کے ٹائٹل پر اُس کے مضامین کا جوخاکہ دیکھا تو اندازہ لگایا کہ، اُن ہی مذکورہ اُمور کو جدید اُسلوب میں پیش فرمایا ہوگا، کتاب کھولی، آپ کا مقدّمہ پڑھا، اُس کے بعد کتاب کا پہلا عنوان: ''دینِ اسلام کا مزاج اور اُس کی نمایاں خصوصیات'' (تا ص: ۵۸) پڑھا، پڑھتا گیا اور لُطف لیتا گیا، پڑھتے وقت طبیعت کا عجیب حال تھا، حضرت والا نے مُثبَت انداز میں جو باتیں بیان فرمائی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دَورِ حاضر میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو متأثِّر کرنے والی بعض تحریکیں جو چلی ہیں، اگر آپ کا یہ مضمون کوئی شخص پڑھ لے تو اُن تمام غلط تحریکوں کا بہترین جواب ہے۔ اگر کتاب کا یہ

حصہ مزید تفصیل وتشریح کے ساتھ ایک کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہوجاتا تو بہت بہتر ہوتا، اِس کی اشاعت بھی زیادہ مقدار میں ہوتی اور اہلِ نظر وفکر کے لیے واقعۃً مشعلِ راہ کا کام دیتا۔ اِس مضمون کے پہلے پانچ نمبر میں آپ نے دِینی مزاج کی روح کھینچ کر بھردی ہے۔ احقر نے بھی اپنے ذوق کے مطابق دِینی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اور کرتا رہتا ہوں، یہ باتیں یکجا کہیں نظر نہیں آئیں، اُن کا استنباط آپ ہی کا حصہ ہے۔ **فجزاکم اللہ تعالیٰ عن الاسلام و جمیع المسلمین احسن الجزاء.**

بیعتِ عَقبۂ ثانیہ کے واقعے سے آپ نے جو استنباط فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اُس کو پڑھ کر رُوح پھڑک اُٹھی۔ اور آخر میں اِس عنوان کا آخری پیرا اور اُس کا بھی آخری حصہ ''اِسی کے ذریعے ہم ہر دَور میں حق و باطل کی آویزش نیز آمیزش میں (جو بعض اوقات آویزش سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے) دینِ صحیح کی صراطِ مستقیم پر قائم بھی رہ سکتے ہیں، اور اُس کی خدمت وحفاظت کی سعادت وتوفیق بھی حاصل کرسکتے ہیں'' پڑھ کر قلب پر مسرت کی عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ حضرات والا کی خدمت میں کبھی عریضہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی؛ لیکن مذکور کتاب کا مذکورہ حصہ پڑھ کر اپنے جذبات وتأثُّرات کے اظہار کے لیے بے اختیار قلم وکاغذ لے کر بیٹھ گیا۔

حضرت والا کی خدمت میں ایک دل کی بات عرض کرتا ہوں جو بار بار دل میں گردش کرتی رہتی ہے، وہ یہ کہ: دَورِ حاضر میں مسلمانوں میں اِس قسم کا دینی مزاج پیدا کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ اور اِس کے لیے دَورِ حاضر کے علُما کس نَہج پر کام شروع کریں؟ اِس سلسلے میں مختصر ہدایت نامہ کے طور پر آپ کچھ تحریر فرمائیں۔ نیز علُما میں خدمتِ اسلام اور دِین کی جِدّ جُہد کے لیے مَر مِٹنے کا بے مثال جذبہ کس طرح پیدا ہو؟۔

احقر نے اپنے دلی جذبات وتأثُّرات کو بے ہنگم طریقے سے حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا ہے؛ ممکن ہے اِس میں کوئی گستاخی کا جملہ ہو، اگر آپ ایسا محسوس فرمائیں تو اُس کے لیے مُعافی چاہتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ آپ کی شخصیت کو دِین وملّت کی خدمت کے لیے تادیر زندہ وسلامت رکھے، اور اپنے لیے بھی حضرتِ والا سے دعا کی عاجزانہ درخواست ہے کہ: اللہ تعالیٰ حقیقی معنیٰ میں اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

مقصودِ عریضہ صرف جذبات وتأثُّرات کا اظہار تھا؛ اِس لیے جوابی خط نہیں بھیج رہا ہوں۔ دعا کی مکرَّر درخواست ہے۔ والسلام العبد احمد عفی عنہ خانپوری

خادم تدریس وناظم تعلیمات جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

۱۲/۱۶/۱۴۰۳ھ، ۹/۲۴/۸۳ء

مکتوبِ بالا سے مولانا کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مکتوب کا لفظ بہ لفظ پڑھنے کے قابل ہے، مفتی صاحب کی شرافتِ نفس، عُلوِّ فطرت اور لطیف جذبات و احساسات کا بولتا ثبوت ہے۔

اِسی محبت کا ردِّ عمل سمجھنا چاہیے کہ، ایک موقع پر ہندوستانی اسلام دشمن لابی نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو بدنام کرنے اور اُن کی کردار کُشی کے لئے ایک خطرناک مُہم چلائی، تو مفتی صاحب نے ''مجلسِ تحفُّظِ مدارس'' کے پلیٹ فارم سے بہ ایں الفاظ تردید فرمائی:

''مفکّرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب دامت برکاتہم کی شخصیت اِس وقت اسلافِ کرام کا پاکیزہ نمونہ اور عُلمائے سلَف کی زندہ تصویر ہے، ہندوستان اور برِّ صغیر ہی نہیں؛ بلکہ پورے عالَمِ اسلام میں آپ کا مقام ومرتبہ مُسلَّم اور آپ کا وجود مُغتنَم ہے، آپ کی خدمات کا دائرہ ملک وملّت، علم وادب، تصوُّف وسلوک، نظم وانتظام، تحریر و

تقریر، تعلیم وتبلیغ، دعوت وارشاد کے مختلف میدانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ عرب وعجم، ایشیا و یورپ نے آپ کے کمالات واوصاف کا لوہا مانا ہے، آپ کے لیے اظہارِ حق کی راہ میں کبھی حکومت وسطوَت اور منصب رُکاوٹ نہ ڈال سکے۔

گذشتہ دنوں ہندوستانی مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام دشمن لابی کی طرف سے جو پروگرام شروع کیا گیا تھا، اُس کے خلاف دِینی تصلُّب سے کام لے کر اُمَّتِ مسلمۂ ہندیہ کی جو رہنمائی فرمائی، اُس سے بھُنّا کر اُس لابی نے آپ کی کردار کُشی کے لیے ایک مستقل مُہم چلائی، اُس کا ایک حصہ وہ جھوٹی خبر ہے جو میڈیا کی وِساطت سے آپ کے متعلِّق پھیلائی گئی، اِس کی ابتداء دہلی کے اخبار ''جنتا'' نے کی، اور اِسی کا چَربہ گجرات کے روزناموں نے اُتار کر غیر مسلموں کے ساتھ بہت سے مسلمانوں کے قلوب میں بدگمانی کا بیج بویا، اِس سازش کا ایک مقصد قومی مُفاخَرت پھیلانا بھی تھا، حالاں کہ آپ نے پیامِ انسانیت کے اسٹیج سے قومی یک جہتی کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

''مجلسِ تحفُّظِ مدارس'' کا آج کا یہ اجلاس میڈیا کی اِس شرارت پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتا ہے، اور اربابِ حکومت کے ساتھ سیکولر ذہن کے برادرانِ وطن سے مطالبہ کرتا ہے کہ: وہ اِس نوع کی شرارتوں کو پنپنے کا موقعہ نہ دیں''۔

۱۴۱۶ھ میں مفتی صاحب کا آپریشن ہوا، مولانا کی خدمت میں حسبِ معمول دعا کے لیے عریضہ ارسال فرمایا، جس کا جواب آیا:

باسمہ تعالیٰ

لکھنؤ: ۱/۷/۱۴۱۶ھ

فاضلِ گرامی قدر جناب مفتی صاحب! زادہ توفیقاً

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا مکتوب مؤرخہ ۲۹/ذی الاخریٰ موصول ہوا، اُمید ہے کہ آپریشن بہ خیر وخوبی کامیابی کے مرحلے سے گذر چکا ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحّت، سلامتی اور تندرستی عطا فرمائے، اور زیادہ سے زیادہ اپنی مرضی کا کام لے۔

ہم چوں کہ اِس مرحلے سے گذر چکے ہیں؛ اِس لیے اِس راہ کی دشواریوں اور نزاکتوں سے واقف ہیں، آپریشن کے بعد کی کیفیت سے بھی مطّلع کریں گے؛ تاکہ تشویش و تردُّد دُور ہوجائے۔ والسلام

مخلص: ابوالحسن علی ندوی

دن بہ دن یہ تعلُّقِ محبت بڑھتا رہا، اور جیسا کہ محبت کا قاعدہ ہے کہ: وہ حصولِ قُرب کے لیے کوئی نہ کوئی تقریب پیدا کرہی لیتی ہے۔

۱۹۹۵ء میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا بارہواں اجلاس احمد آباد میں طے ہوا، اجلاس کی ''مجلسِ استقبالیہ'' کی صدارت کے لیے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اور حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحبؒ کی نظرِ انتخاب نے آپ کو منتخب فرمایا (جس کا ذکر خود حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کی تحریر میں آگے آرہا ہے)، اِس اجلاس کے لیے ''خطبۂ استقبالیہ'' بھی تحریر فرمایا، اجلاس اور خطبہ دونوں ذمّے داری کو آپ نے خوب اچھی طرح نبھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ اجلاس اور خطبے کی مقبولیت کے پسِ پردہ دو عظیم الشان سادات بزرگ (حضرت سید مولانا علی میاں اور حضرت مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ) کی دعا وتوجُّہ شاملِ حال تھی۔

حضرت سید مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے ہمت اَفزائی پر مشتمل ایک تحریر مفتی صاحب مدظلہٗ کے نام تحریر فرمائی:

باسمہ تعالیٰ

محترم المقام حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

بعد سلام مسنون! مزاج گرامی بہ خیر ہوگا۔ عرض ایں کہ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے اجلاس کے لیے ایک پیغام اِرسال کیا ہے، اِس کی فوٹو کاپی آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ آپ نے خطبۂ استقبالیہ تیار فرما لیا ہوگا، اللہ پاک غیب سے باتیں اِلقاء فرمائیں اور مدد فرمائیں۔ دعا کرتا ہوں: اللہ پاک آپ کی خوب لاج رکھے اور خوب خوب مدد فرمائے، اجلاس کو ہر اعتبار سے کامیاب فرمائیں، دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں۔ فقط والسلام

(بحکم حضرت اقدس حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہ)

سامعین نے خطبۂ استقبالیہ کو خوب خوب پسند کیا، بعض اربابِ بصیرت نے اجلاس کا ''لُبِّ لُباب'' قرار دیا۔

یہ خطبۂ استقبالیہ ماہنامہ الفرقان (دسمبر ۱۹۹۵ء) میں ''اسلام کا مستقبل یقیناً روشن ہے؛ مگر ہمارا مستقبل؟'' کے عنوان سے زیورِ طبع سے آراستہ ہے، اُس کے شروع میں بہ طورِ تعارُف مدیرِ رسالہ مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی مدظلہ رقم طراز ہیں:

(گجرات کے تاریخی شہر احمد آباد میں ۷/۸/ا اکتوبر ۹۵ء کو ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا بارہواں اجلاس منعقد ہوا تھا، اجلاس کی ''مجلسِ استقبالیہ'' کے صدر حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہ (صدر مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) تھے، جو نہ صرف صوبہ گجرات؛ بلکہ ملک کے بالغ نظر اور فقیہ النفس اہلِ علم میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے جو خطبۂ استقبالیہ پیش کیا وہ اکثر حاضرین کے خیال میں پورے اجلاس کا حاصل تھا، اور اُسے ملّتِ اسلامیہ کے

نام ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے پیغام کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

ذیل میں ہم اپنے قارئین کے لیے وہ خطبۂ استقبالیہ بعینہٖ پیش کررہے ہیں، اِس خطبے کے لیے نیز اجلاس کے شاندار انتظامات کے لیے ہم مولانا محترم کو اور اُن کے توسُّط سے تمام ارکانِ استقبالیہ کو مبارک باد بھی پیش کرتے ہیں۔ مدیر: خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی)

۲۰۰۰ء میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے وصال کے بعد ڈیوز بری کے سمپوزیم کے لیے مفتی صاحب نے ''مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی عظمت ومقبولیت کا راز'' کے نام مقالہ پیش فرمایا تھا، جو درحقیقت ''در حدیثِ دیگراں'' یا ''درحدیثِ علی میاں'' پر مشتمل ہے۔ مقالہ نہایت ہی اہم ہے، مادِّیت اور زَرق و برق کے اِس دَور میں علمِ دین سے وابستہ حضرات کو اِس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ مقالہ چند سال قبل ''فرید بک ڈپو دہلی'' سے طبع ہوا تھا، عرصۂ دراز سے یہ گوہرِ نایاب دستیاب نہیں تھا، بہ الفاظِ دیگر مقبولیت کا یہ راز صیغۂ راز میں تھا، ضرورت تھی کہ اِس کو منصّۂ شہود پر لا کر اُس کا اِفادہ تمام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ''ادارۃ الصدیق ڈابھیل'' کے ذمّے داران کو جزائے خیر عطا فرمائے، کہ اُنھوں نے اِس کی طرف توجُّہ فرما کر اُس کو حیاتِ نو بخشی۔ **فجزاهم الله عني و عن سائر أرباب المحبة.**

مقالہ اور خطبۂ استقبالیہ دونوں کی تیاری میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی نسبت کو دَخل ہے؛ اِس لیے خطبے کو مقالے کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے؛ تاکہ یہ دو یادگار تحریریں ساتھ ساتھ محفوظ رہیں۔ فقط

عبدالقیوم راجکوٹی

معین مفتی دارالافتاء جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات

۲۳/ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ

مفکّرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندویؒ کی عظمت ومقبولیت کا راز

از قلم:

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

آج کی مجلس جس میں وقت کے بڑے بڑے عُلَما اور اصحابِ قلم حضرات رونق افروز ہیں، مجھ جیسے بے بِضاعت طالبِ علم کا اِن سُطور کو پڑھنا اِن حضرات عُلما کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ اِس بابرکت وعظمتِ مجلس کی ناقدری وتوہین کے مُترادِف ہے؛ لیکن اِس مجلس کے داعی: محترم جناب الحاج ظفر بھائی کے تعلُّق ومحبت نے اِس کے لیے مجھے مجبور کیا۔ اِنھوں نے جب از راہِ کرم وذرّہ نوازی مجھے اِس میں شرکت کی دعوت پیش کی تو مَیں نے صاف صاف بتلا دیا کہ، مجھے مضمون نگاری اور مقالہ نویسی سے کوئی مناسَبت نہیں، نہ اِس لائن کا آدمی ہوں؛ اِس لیے آپ مجھے اِس شرکت سے معذور رکھیں؛ مگر اُن کو جو تعلُّق ومحبت احقر کے ساتھ ہے جس کی بنیاد بھی ایک اعتبار سے حضرتؒ کی ذات بابرکات ہی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا بارھواں اجلاسِ عام ''احمد آباد'' میں منعقد کرنا جب تجویز ہوا تو اُس اجلاس کے لیے زمین تیار کرنے کے لیے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مدظلہم احمد آباد تشریف لے گئے، اُس موقع پر ایک مجلس میں ''مجلسِ استقبالیہ'' کی صدارت کے لیے قحطُ الرجال کے نتیجے میں احقر کا نام پیش فرمایا، جس کو مجلس میں موجود تمام احباب نے منظور فرمالیا۔ اُس مجلس میں احقر خود موجود نہیں تھا، بعد میں جب مختلف ذرائع سے اِس کا علم ہوا تو اِس بارِگراں کے تحمُّل سے اپنے ضعف وناتوانی، اور اِس ذمّے داری کی ادائیگی سے اپنی نااہلی کی بنا پر احقر نے صاف معذرت وانکار کیا؛ لیکن احقر کی یہ معذرت قبول نہ ہوئی۔ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب نقویؒ (سابق ناظم کتب

خانہ ندوۃ العلماء اور متعمّد خصوصی حضرت مولاناؒ) کے ایماء پر خود حضرت مولانا نے اِس خدمت و ذمّے داری کے قبول کرنے اور انجام دینے کے لیے ایک گرامی نامہ اَحقر کے نام اِرسال فرما کر عزت افزائی فرمائی۔ مزید برآں احقر کے مُربّی و سرپرست حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب دامت برکاتہم کے نام ایک گرامی نامہ تحریر فرما کر اُن سے گذارش کی کہ: وہ مجھے اِس کا حکم دیں، چناں چہ اِن ہر دو اکابر کے ارشاد کے بعد تو میرے لیے تعمیلِ ارشاد کے سِوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

اِس ذمّے داری سے سبکدوشی میں جن حضرات نے احقر کا بھرپور تعاون کیا اُن میں محترم الحاج ظفر بھائی بھی ہیں، کہ اِنھوں نے اُس زمانے میں حضرتؒ کے ساتھ اپنی محبت وعقیدت اور تعلُّق کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اُسی زمانے سے یہ محبت وعنایت کا معاملہ احقر کے ساتھ برابر فرماتے چلے آرہے ہیں، اور آج کی اِس مجلس کا انعقاد بھی اِن کی حضرتؒ کے ساتھ محبت وعقیدت اور تعلُّق ہی کا نتیجہ ہے، ہمارے جس تعلُّق محبت کی ابتدا حضرتؒ کی نسبت پر ہوئی تھی اُسی تعلُّقِ محبت کی مناسَبت سے اُن کی طرف سے بہ اِصرار پیش کی جانے والی اِس دعوت نے آخر مجھے اِس گستاخی کا موقع فراہم کیا ہے:

امید ست کے بیگانگیٔ عرفی را		بہ دوستی سخنہائے آشنا بخشند

یہ موضوع کیوں منتخب ہوا؟

محترم داعی صاحب کے اصرار پر جب احقر نے یہاں حاضری کا قصد کرلیا تو اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ، حضرت مولاناؒ جیسی ظاہری وباطنی اوصاف وکمالات کی حامل وجامع، عظیم المرتبت، ہمہ جہتی اور تاریخ ساز شخصیت پر مَیں کیا پیش کروں؟ جب کہ مجھے حضرتؒ کی خدمت میں رہنے کا بھی موقع مُیسّر نہیں آیا، خصوصاً جب کہ مضمون نگاری یا

مقالہ نویسی کے کوچے سے بھی نابلد ہوں، بڑے شش و پنج اور کشمکش کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا کہ، حضرت کے بے شمار اوصاف اور کمالات میں سے چند ایسی چیزیں پیش کروں جس کی طرف اِس دَورِ مادّیت میں اہلِ علم کو خصوصی توجُّہ دینے کی ضرورت ہے، کہ کسی بھی بزرگ وعظیم شخصیت کے انسانی اخلاق، علمی وعملی کمالات، تعلیم وتدریس یا تصنیف، مُعاصِرین کے ساتھ تعلُّقات، روزمرَّہ کے معمولات، اُن کی وسیعُ النّظری، وسیع القلبی، حقیقت پسندی، اسلام کے لیے فکرمندی اور اہل اسلام کے لیے دردمندی ہی وہ قابلِ تقلید وقابلِ اتِّباع اُمور ہیں، جن کو علمی وفکری ذوق رکھنے والا متجسِّس طبقہ اُن کی زندگی میں تلاش کرتا ہے؛ تاکہ اُن کو اُن بزرگ کے کمالات، اُن کی جامعیت، اُن کے علمی وتصنیفی مرتبہ، اُن کی اخلاقی بلندی، اُن کی دینی کوششوں اور تعلیمی اداروں سے گہرے تعلق، فکرمندی ودل سوزی، علومِ دینیہ، عقائدِ حقّہ اور مسلکِ حق کی اشاعت سے دلی شغف، مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی فکر اور انابت ورجوع الی اللہ، اور اتباعِ شریعت وسنت کی دعوت اور اِس کے لیے جدّ وجُہد کا اندازہ ہو، اور اُن میں عمل کا جذبہ بیدار ہو، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہو، ہمت میں بلندی، قلب ونظر میں وسعت اور وقت کی قیمت اور زندگی کی کوتاہی کو شعور، عمل نافع اور باقیات صالحات کے ذخیرے کا شوق اور آرزو پیدا ہو۔

حضرتؒ کے ظاہری وباطنی اوصاف، علمی وعملی کمالات، دعوتی وتصنیفی اور تحریری وتقریری کارناموں کی فہرست تو بڑی طویل ہے:

از فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم	کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن آج اہلِ علم کو اپنی علمی ودینی، تعلیمی وتبلیغی سرگرمیوں کی انجام دَہی کے لیے

جس اخلاص وللّٰہیت، حیاتِ قلبی وحرارتِ باطنی کی اَشد ضرورت ہے، اور جس کے بغیر دِین کی کوئی گاڑی چلتی نہیں ہے، اُس کے حصول کی طرف سے جو غفلت وبے توجُّہی برتی جارہی ہے، اور اُس کے ساتھ تساہُل وتجاہُل کا جو معاملہ کیا جارہا ہے اُس نے ہماری اُن خدمات ومَساعی کو بے روح بناکر رکھ دیا ہے۔ یہ حرارتِ باطنی: تعلق مع اللہ، عشقِ رسول ﷺ، لقائے رب اور جنت کا شوق، ایمان کی قوت اور حق بات کہنے کی جُرأت کا نام ہے، اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی تقویٰ وطہارت، زہد وتوکل، تواضع وبے نفسی، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی رغبت جیسی صفات سے آراستہ ہو۔

ظلم، تکبُّر اور غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا

حضرت مولاناؒ جس خاندان سے تعلُّق رکھتے تھے، اور جس گھرانے میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، اور جس ماں کی آغوشِ تربیت میں آپ نے پرورش پائی، اُس کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے کہ آپ اُن صفات سے بھی بہرہ ور ہوں۔ والدہ محترمہ کی تربیت ونگرانی کے سلسلے میں خود حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

”گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی ودینی تربیت کی ذمّے دار تھیں، مجھے قرآن کی بڑی بڑی سورتیں اُنھوں نے اُسی زمانے میں یاد کرائیں، باوجود اِس کے کہ اُن کی شفقت خاندان میں ضرب المَثَل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں؛ لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں: ایک تو نماز کے بارے میں مطلقاً تساہُل نہیں برتتی تھیں، مَیں عشاء کی نماز پڑھے بغیر کبھی سو گیا، خواہ کتنی ہی گہری نیند ہو، اُٹھا کر نماز پڑھواتیں، اور نماز پڑھے بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں، اِسی طرح

فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بیٹھا دیتیں۔ دوسری بات -جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں، اور اُس میں اُن کی غیر معمولی محبت وشفقت حارج نہ ہوتی - یہ تھی کہ: اگر مَیں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا، یاحقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا،تو وہ نہ صرف مجھ سے مُعافی منگواتیں؛ بلکہ ہاتھ تک جُڑواتیں، اُس میں کتنی ہی اپنی ذلّت اور خِفّت محسوس ہوتی؛مگر وہ اُس کے بغیر نہ مانتیں۔ اِس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا، اور ظلم وتکبُّر وغرور سے ڈر معلوم ہونے لگا، اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اِس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کرلینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا‘‘۔

بیٹا! یہ تمھارے کھانے کا نہیں

والدہ صاحبہ کی تربیت کے اِس انداز کا ذکر کرتے ہوئے ایک تجرَبے اور مشورے کے طور پر اِس کا بھی ذکر کردینے کو جی چاہتا ہے کہ، بچوں کی مذہبی واخلاقی اُٹھان اور اُن کے اِس قابل ہونے میں کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اپنے دین کی کوئی خدمت لے یا قبولیت عطا فرمائے، دو چیزوں کا بڑا دَخل ہے: ایک کہ (وہ اپنی عمر کے مطابق) ظلم اور دل آزاری سے محفوظ رہیں، اور کسی دُکھے دل کی آہ یا مظلوم کی کَراہ اُن کے مستقبل پر اثر نہ ڈالے۔ دوسرے یہ کہ اُن کی غذا غَصَب وحرام اور مشتبہ مال سے پاک رہے۔ بہ ظاہر اللہ تعالیٰ نے اِس عاجز کے ساتھ اِن دونوں چیزوں کا انتظام فرمایا: میرا ددیہال جائداد واَملاک اور مُشترک مال وحقوق سے عرصے سے محفوظ تھا، والد صاحب کی آمدنی خالص طِبّی پیشے کی رہینِ مِنّت تھی، ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مشتبہ مشکوک مال سے بچایا؛ بلکہ بدعات ورُسوم کے کھانوں سے بھی۔ اِس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آگیا: مَیں اپنے گھر کی ایک بڑی

بوڑھی انّا کے ساتھ - جو پڑھی لکھی نہ تھیں - اپنی پھوپھی کے پاس ''خالص ہاٹ'' (رائے بریلی کا ایک محلّہ) جا رہا تھا، راستے میں کہیں غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا (جو چالیسویں یا صدقے کا کھانا تھا)، بڑی بی نے - جن کے ساتھ مَیں جا رہا تھا - وہ کھانا لیا اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگیں، مَیں بچہ تھا، میرے بھی منھ میں پانی بھر آیا، مَیں نے بھی شرکت کرنا چاہی، اُنھوں نے کہا: بیٹا! یہ تمھارے کھانے کا نہیں، اور اُنھوں نے مجھے کھانے نہیں دیا۔ یہ غالباً گھر کے ماحول اور احتیاط کی اُس فضا کا نتیجہ تھا جس کو وہ دیکھا کرتی ہوں گی۔

بچپن کی دل چسپی

''اُسی زمانے میں ہمارے خاندان میں ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ: جہاں کوئی ایسا غم ناک واقعہ پیش آتا، دل دُکھے ہوئے ہوتے یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی، تو ''صمصام الاسلام'' سنی جاتی۔ یہ مشہور مؤرِّخ واقدیؒ کی مشہور کتاب ''فتوح الشام'' کا پچیس ہزار اشعار میں ترجَمہ ہے، یہ ترجَمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ، میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا: منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی لکھی ہوئی ہے۔ جوش وخروش سے بھری ہوئی، درد واثر میں ڈوبی ہوئی، جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے کہ دل جوش میں اُچھلنے لگتے ہیں اور نبض تیز ہو جاتی ہے، شہادت کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں کہ خود راہِ خدا میں جان دینے کے لیے دل بے تاب ہو جاتا ہے، اور صحابۂ کرام اور مجاہدین کے غم کے سامنے آدمی اپنا غم بھول جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ مرحومہ صالحہ بی - جو قرآن مجید کی حافظ بھی تھیں - یہ منظوم فتوح الشام بڑے پُر اثر اور دل کش لہجے میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب اُن کو بہت رواں ہو گئی تھی، عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آجاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بااِرادہ

بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں، پھر جب اُس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اُس مجلس میں شریک ہوتے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۸۱تا ۸۳)

بڑے بھائی صاحب نے بھی کمی نہ رکھی

والد ماجد کی وفات کے بعد آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سرپرستِ خاندان تھے، اور اِن کی محبت میں پدرانہ شفقت جَلوہ گر تھی؛ مگر وہ ابھی تعلیم کے آخری مرحلے میں تھے، نواب نورالحسن صاحب کی کوٹھی میں اُن کا قیام تھا، وہاں اُنھوں نے حضرت مولانا کو بھی اپنے پاس بُلا لیا، اُن کی تربیت کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''اِس ماحول میں (یعنی نوابی ٹھاٹھ باٹھ اور ریاست کی اِمارت وشوکت اور بڑے نامور افراد کی آمد ورفت کے ماحول میں) بھائی صاحب دو باتوں کا خاص اہتمام رکھتے تھے: ایک یہ کہ نماز جماعت کے ساتھ پابندی سے پڑھتا ہوں، کبھی ایسا ہوا کہ وہ میڈیکل کالج سے واپس آئے، واپسی بالعموم مغرب کے بعد ہوتی تھی، اور پوچھا: ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں پڑھی تھیں؟ مَیں نے اثبات میں جواب دیا، اُن کو کچھ شبہ ہوا تو تینوں نمازیں دوبارہ پڑھوائیں۔ دوسرے یہ کہ مَیں کوٹھی کے ملازموں کے پاس (جن کی بڑی تعداد تھیں) زیادہ نہ بیٹھوں اور بے تکلُّف نہ ہوں، نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ کسی سے لے کر نہ پڑھوں، وہ ہمارے اُس ذاتی کتب خانے میں سے خود کتابیں انتخاب کر کے دیتے اور مطالعہ کرواتے، اُن کتابوں میں سب سے پہلی جو کتاب اُنھوں نے پڑھنے کو دی ''سیرتِ خیر البشر'' تھی، اِس کے بعد غالباً ''رحمۃٌ لِلّعالمین'' مطالعے میں آئی''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۸۷)

عرب استاذ

آپ کی جب باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی تو شیخ خلیل عرب آپ کے استاد مقرّر ہوئے، جو قرآن مجید کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، اُن کو اِس کا بڑا شغف تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو رِقّت اور اثر پذیری کی دولت سے حصہٗ وافر عطا فرمایا تھا، مسجد میں اکثر صبح کی نماز وہی پڑھاتے تھے، قرآن مجید پڑھتے وقت قابو میں نہیں رہتے تھے، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے، آواز گلو گیر ہوجاتی، فجر کی نماز میں وہ آخری پاروں کی کوئی بڑی سورۃ شروع کرتے؛ لیکن فرطِ تأثُّر اور شدَّتِ گریہ سے اُس کو مکمل کرنے کی نوبت کم آتی، اور سامعین کو حسرت رہ جاتی کہ پوری سورۃ نہیں سن سکے۔ حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

’’میری تعلیمِ قرآن کا آغاز اِن ہی کے یہاں ہوا، شیخ پر توحید کا بڑا غلبہ تھا، اور وہ بڑا کھرا اور صاف عقیدہ رکھتے تھے، اور اپنے شاگردوں کو بھی اِس عقیدے کا قائل بنانا چاہتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے ایسے صحیح العقیدہ آدمی سے پڑھنے کا موقع عنایت فرمایا۔ سورۂ زمر- جس میں توحید کی بڑی صاف اور طاقتور تعلیم ہے- اُن کی محبوب اور منتخب سورۃ تھی، جب ہم عربی میں کچھ چلنے لگے تو اُنھوں نے اِس سورۃ کا درس شروع کیا‘‘۔ (میر کارواں: ۴۰)

حضرت مولاناؒ کی ادبِ عربی کی تکمیل اِن ہی کے پاس ہوئی، اور اِس طرح عقیدۂ توحید کی پختگی جو آپ کے خاندان اور گھرانے کی خصوصیت اور امتیازی وصف تھا، جہاں آپ نے آنکھیں کھولیں، اور گھر کے باہر جو پہلے استاد ملے اُن کو بھی اللہ تعالیٰ نے اِس دولت سے حصہٗ وافر عطا فرمایا تھا، اِس طرح ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اِس

نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ وَر ہونے کا موقع فراہم کیا۔

شیخ خلیل عرب صاحب سے پڑھنے اور ادب کی تکمیل کرنے کے بعد حدیث کی کتابیں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ سے پڑھیں، جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قُدِّسَ سِرُّہٗ کے مجاز تھے، اُن کی سیرت سلفِ صالحین کے اخلاص وصداقت کی نمائندہ تھی، اِس کے بعد مولانا احمد علی لاہوریؒ سے رُجوع کیا۔

تفسیر، بیعت وریاضت

لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کی خدمت میں آپ کا قیام ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۲ء کے درمیانی زمانے میں تین قسطوں میں رہا، اور اِس مدت میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے قرآن کی تفسیر وترجَمہ کے عِلاوہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا درس بھی لیا، اور دونوں کا امتحان دے کر اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ اُن سے بیعت واِرادت کا تعلُّق بھی قائم فرمایا۔ اِس کے بعد ۱۹۳۴ء میں حضرت مولانا کی ہدایت واِیماء پر کچھ دن اُن کی صحبت اور تربیت میں رہنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر وشغل کرنے کے لیے حاضر ہوئے، آپ کا یہ قِیام تین ماہ کا تھا، اِس مدتِ قِیام میں حضرت مولانا احمد علیؒ نے آپ سے ریاضتیں بھی کرائیں، خود حضرت مولاناؒ اپنے اِس قیام کا اِجمالی حال بتلاتے ہوئے ''کاروانِ زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''گویا میرا گھر موجود تھا؛ لیکن مولانا (احمد علیؒ) نے ہدایت فرمائی کہ مَیں شاہی مسجد کے کسی حجرے میں علاحدہ رہوں، کھانا بھی گھر سے آجایا کرے، مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کروں''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۱۳۴)

یہ کوئی معمولی بات نہیں

کیا کیا ریاضتیں تھیں جو اُس خلوت گزینی کے زمانے میں کرائی گئیں؟ اُن کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے؛ البتہ ذکر اللہ کی کثرت تو اِس کا ایک لازمی حصہ ہے، جس کی برکات کی طرف خود حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے اپنے ایک مکتوب میں- جو آپ کے نام بھیجا گیا تھا- ارشاد فرمایا تھا:

"اللہ کے مبارک اسم میں اِنقِطاع عَنِ الخَلق اور اِحتیاج اِلی اللہ کا زبردست اثر ہے؛ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ بارہ تیرہ سو کی ماہوار رقم کا حَسبۃً للہ چھوڑ دینا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ اُس پاک نام کی ہزاروں برکتوں میں سے ایک برکت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مبارک نام کی اَور برکتوں سے آپ کو مالا مال فرمائے"۔

کہیے مولانا علی میاں صاحب!

۱۹۳۲ء میں آپ نے اپنے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ (جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے مجاز تھے) کی ہدایت پر چار ماہ کا عرصہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں بھی گزارا، اُس زمانے میں بخاری وترمذی کے درس میں شرکت کے عِلاوہ قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے کے لیے خصوصی اوقات میں علمی استفادہ بھی کیا، اور خود حضرت مولاناؒ کے الفاظ میں:

"دار العلوم کے اِس چار ماہ کے قیام میں میری دل بستگی کے سامان اور میرے اُنس وعقیدت کا مرکز مولانا مدنیؒ کی ذات تھی، اور اصل مناسبت اِن ہی سے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ، صبح کبھی اپنے خاص لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے: کہیے مولانا علی میاں صاحب! آج اخبار میں آپ نے کیا پڑھا؟ تو مجھے دن بھر اِس کا مزہ آتا رہتا، اور

دل مسرت سے معمور؛ بلکہ مخمور رہتا۔ بہ قول شاعر:

جو بہ وقتِ ناز کچھ جنبش ترے اَبرو میں تھی	بہرِ تسکینِ دل رکھ لی ہے غنیمت جان کر

(کاروانِ زندگی ۱/۱۳۰)

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اِس خلوت وریاضت کے نتیجے میں اَورادوتلاوت، سحر خیزی، آہِ نیم شبی کی دولت -جو کسی کو آخر عمر میں ملتی ہے- آپ کو ابتدائی عمر سے حاصل رہی۔ حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

(حضرت مفکرِ اسلام نے) ۱۹۴۰ء میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے تبلیغی کام کا ذکر سنا، تو اُس کے لیے دلی کا سفر کیا، اور وہاں سے واپس آکر ندوہ کے جمالیہ ہال میں اِس کام کی اہمیّت پر ایک تقریر کی اور اِس پر طلبا کو ابھارا، اُن کی تقریر کے بعد پانچ یا چھ طالب علم اِس کام کے لیے تیار ہوئے، چناں چہ لکھنؤ کے آس پاس کی بستیوں میں طلبا کا ایک قافلہ جمعرات کو ملہور، جگلور، اور علی گنج وغیرہ بستیوں میں پیدل جاتا، اور جمعہ کے بعد وہاں سے واپس آتا۔ ایک دوسفر کے بعد راقم الحروف بھی اُس میں شریک ہونے لگا، پہلے ہی سفر میں ''ملہور'' جانے کا اتّفاق ہوا، گرمیوں کے زمانے میں عشاء بعد ہم لوگ مسجد کے صحن میں سوئے ہوئے تھے، میری بغل میں مولانا آرام فرما رہے تھے، تین بجے رات میں استنجے کے لیے نیند کھلی تو دیکھا کہ، مولانا اپنی جگہ پر نہیں ہیں، لوٹا لے کر کھیت کی طرف استنجے کے لیے گیا تو دُور سے کچھ رِقّت آمیز آواز آرہی تھی، قریب گیا تو دیکھا کہ: مولانا مصلیٰ بچھا کر تہجد کی نماز ادا کر رہے ہیں، اور آواز میں ایک رِقّت ہے۔ مولانا مسجد کے صحن میں ایک طرف یہ نماز ادا کر سکتے تھے؛ مگر دو وجہ سے اُنھوں نے ایسا نہیں کیا: ایک یہ کہ

لوگوں کی نیند میں خلل نہ پڑے، اور دوسرے یہ کہ، نوافل کی روح یعنی اِخفا بھی باقی رہے۔ یہ بالکل اُسوۂ نبوی ﷺ کی تعمیل تھی: حدیث میں حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ: تہجد کے وقت جب حضور ﷺ نماز میں قرآن کی تلاوت فرماتے، تولَـهٗ أَزِیْزٌ کَـأَزِیْزِ الْمِـرْجَلِ یعنی: آپ کے سینے سے رِقَّت کی ایسی آواز آتی جیسے ہانڈی کے اُبلنے کی آواز ہوتی ہے۔ (ماہنامہ الرشاد، شمارہ: ۲۲۵)

پھل دار درختوں کے سائے میں

غرض بچپن سے لے کر نوجوانی تک کا پورا زمانہ اولیائے صالحین کی صحبت میں گزارا، اور انسان کی زندگی کا یہی زمانہ اُس کی شخصیت کی تعمیر کا بنیادی زمانہ ہے، اِسی میں آدمی کے ذہن کا سانچہ بنتا ہے، اِس عمر میں جو مزاج بن گیا وہ زندگی بھر نہیں بدلتا، یہ سنتِ الٰہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں۔ آپ کی زندگی کا یہ زمانہ ولی صفت والدہ صاحبہؒ، برادرِ معظّم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ، مولانا خلیل عربؒ، حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی نگرانی وسرپرستی، اُن کی تربیت وتعلیم، اُن کی شفقتوں اور محبتوں کے سائے میں گزرا، اِس کے بعد حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں آپ نے جو زمانہ گزارا اُس کے متعلّق آپ کا یہ جملہ -جو آپ نے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے متعلق ایک مضمون میں لکھا ہے- بہت کچھ اشارہ کرتا ہے:

’’میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خَیال ہے بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا: پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحبؒ سے تعلق پیدا ہوا، دوسرا موڑ اُس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے پاس

پہنچایا‘‘۔(پُرانے چراغ ۱/۱۳۴)

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی توجّہ وعنایت نے آپ کے دل کی اَنگیٹھی کو خوب گرما دیا، پھر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی صحبتِ بابرکت اور توجّہاتِ عالیہ نے آپ کے کمالاتِ باطنی کو جِلا بخشی۔

بحرِ مادّیت کا جزیرۂ رُوح

حضرت رائے پوریؒ کے ساتھ رَبط وتعلُّق کی ابتدا کو حضرت مولاناؒ نے اِن الفاظ میں ذکر فرمایا:

’’حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے درجے اللہ تعالیٰ بلند فرمائے، کہ وہ مجھے برابر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے ربط بڑھانے اور اِستفادہ کرنے کی تاکید فرماتے رہے، اور لکھتے رہے کہ: ’’اب یہی ایک دکان رہ گئی ہے جس سے اخلاص، تعلُّق باللہ اور تربیتِ نفس کا سودا ملتا ہے، اور وہاں اِس کے سِوا کسی اَور چیز کا ذکر وفکر نہیں‘‘۔

تقسیم کے بعد سے پاکستان جانے اور قدیم مرکزِ روحانی سے تعلُّق پیدا کرنے کی راہ میں جو دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں، اُنھوں نے اَور بھی اِس کی ضرورت پیدا کردی کہ دل کی اَنگیٹھی کو گرم رکھنے، نفس واخلاق کی کمزوریوں پر مُطّلع ہونے اور جس سفر کا مَیں مسافر تھا (دعوت وتصنیف) اُس کے لیے زادِ سفر لیتے رہنے کے لیے ایک ایسی ہی جگہ اور ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی جہاں یہ جنس ملتی ہو، رائے پور جاکر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مادّیت وعقلیت کے بحرِ ظلمات میں- جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے- یہی ایک جزیرہ ہے، جہاں ذکر وفکر کے عِلاوہ کوئی موضوعِ گفتگو اور مشغلۂ زندگی نہیں، اور جہاں پتّے پتّے

سے اللہ، اللہ کی آواز آتی ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۳۵۳)

بے نگاہے از خداوندانِ دل

اِس کے بعد بھی اکابر اہل اللہ اور علمائے ربانیین کے ساتھ رَبط وتعلُّق آپ کا زندگی بھر کا معمول رہا، اور اُن حضرات کی طرف سے بھی آپ کی طرف خصوصی توجُّہ والتفات، محبت وشفقت کا معاملہ برابر رہا، جس کی تفصیل مولانا شمشاد علی قاسمی کی تالیف ''اکابر ومشاہیرِ اُمَّت کی نظر میں'' دیکھی جاسکتی ہے۔ خود حضرت مولاناؒ ''کاروانِ زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''مشائخِ عصر کی خدمت میں اپنے مُرشد ومُربِّی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ اور اپنے اوَّلین شیخ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے ماسِوٰی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مُستَرشِدانہ اور خادمانہ حاضری ہوتی رہتی''۔ (۱/۲۴۴)

اِس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجدِّدیؒ، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ وغیرہ اکابر کی خدمت میں حاضری اور اُن کے ساتھ دلی رَبط وتعلُّق کا اِجمالی حال تحریر فرما کر آخر میں رَقم طَراز ہیں:

''یہ تفصیل اِس لیے لکھ دی کہ: مصر وشام اور تُرکی کے ترقی یافتہ ملکوں اور وہاں کے، نیز ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی حلقوں میں شریک ہونے اور خود اپنے مطالعہ اور تصنیف اور اپنے اُس پیچ وتاب زاری کے ساتھ جس نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا، دوائے دل بیچنے والوں اور عشق واخلاص کی دکانوں سے برابر رابطہ رہا، کہ اِس دَورِ مادِّیت اور اِدِّعائے علم میں یہی چیز کسی درجے میں حفاظت کرنے والی ہے''۔ بہ قول اقبال:

می نہ روید تخمِ دل از آب وگل		بے نگاہے از خدا وندانِ دل

(کاروانِ زندگی ۱/۴۴۷)

بڑا سبق

حضرت مولاناؒ کی خودنوشت سرگذشتِ حیات یعنی ’’کاروانِ زندگی‘‘ میں جگہ جگہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ، آپ زندگی کے مختلف اَدوار میں بے شمار معاملات اور حالات میں اپنے لیے ایک صاحبِ دل بزرگ شخصیت کی سرپرستی اور مشورے کی ضرورت واہمّیت محسوس فرماتے رہے، اہلِ علم اور خواص کے طبقے کے لیے اِس میں بڑا سبق موجود ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولاناؒ کی تعلیم وتربیت سے متعلّق یہ تمام تفصیلات جو احقر نے عرض کیں، آپ میں سے بہت سے حضرات کے علم میں ہوں گی؛ لیکن میرا مقصد اِسی آخری نکتے کی طرف حضراتِ سامعین کی توجُّہ مبذول کرانا تھا۔

اب مَیں مولانا کی زندگی میں سے چند واقعات پیش کرتا ہوں، جن سے حضرت کی تواضع وبے نفسی، تعلُّق مع اللہ، عشقِ رسول ﷺ، زُہدوتوکل، جاہ ومال کی محبت سے دُوری کا پتہ چلتا ہے۔ دَورِحاضر میں اہلِ علم خواص کے طبقے میں اِن ہی صفات کا فُقدان ایک وبائے عام کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے، جس نے اِس طبقے کی تمام مَساعی وخدمات کو بے جان لاشہ بنا رکھا ہے، ہمتیں پَست ہوچکیں اور قلب ونظر میں تنگی آگئی، وقت کی قدر وقیمت نہ رہی، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے احساس میں کمی؛ بلکہ بےحِسی پیدا کر رکھی ہے۔

إِنْ لَّمْ تَكُنْ سَاخِطاً عَلَيَّ فَلاَ أُبَالِيْ کی جھلک

تعلق مع اللہ کی قوت ہی کے نتیجے میں آدمی میں اِنقطاع عَنِ الخَلق اور اِحتیاج

اِلی الخالِق کی کیفیت راسخ ہوتی ہے، حضرت مولاناؒ کے قلب میں اِس کیفیت کے رُسوخ کا حال تو آپ کے مُرشد پاک حضرت لاہوریؒ کے آپ کے نام مکتوبِ گرامی کے حوالے سے ہم پہلے بتا چکے ہیں، حضرت مولاناؒ اپنے احوال وکوائف کو عموماً اپنی تحریروں میں ظاہر ہونے نہیں دیتے؛ لیکن کہیں کہیں اِس کی جھلک محسوس ہوجاتی ہے۔ جون ۱۹۹۸ء میں دیوبند کے ڈاکٹر شکیل احمد نامی نے حضرت مولانا اور بعض دیگر حضرات (جن کا مجلس مُشاوَرت سے رَسمی تعلُّق باقی تھا) کے خلاف مقامی عدالت میں مقدَّمہ دائر کرکے اُن لوگوں کے خلاف تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۴۰۶ر کے ماتحت کارروائی کا مطالبہ کیا تھا، اُنھوں نے الزام لگایا تھا کہ: اِن لوگوں نے میرٹھ اور دیگر مقامات پر فسادات سے متأثّرہ خاندانوں کی امداد کے لیے دس لاکھ روپئے چندہ جمع کیا تھا؛ مگر متأثّرہ خاندانوں کو یہ رقم تقسیم نہیں کی گئی۔ اِسی سلسلے میں عدالت نے اپریل ۱۹۹۸ء میں اِن حضرات کے خلاف غیر ضَمانتی وارنٹ جاری کردیے تھے، جس کی خبر ملک کے تمام اَخباروں میں سرخیوں میں دی گئی۔ اِس پورے واقعے کا تذکرہ ''کاروانِ زندگی'' حصہ ہفتم میں کرنے کے بعد حضرت مولانا آخر میں رقم طراز ہیں:

''اِس اَلمیہ کو جو اِضطراری طور پر بیان کیا گیا ہے کہ، اِس سے ملتِ ہندیہ اسلامیہ کی اُس آزمائشی اور اخلاقی اِنحطاط کی صورتِ حال پر نظر پڑتی ہے، جس کا بیان کرنا بہرحال ایک مؤرِّخ اور سوانح نگار کا فرض ہے، اُسے اِس عربی قطعے پر ختم کیا جاتا ہے جو بہت سے عارفین کی زبان پر رہا ہے، اِس میں تسکین وتسلی کا ایک سامان اور اُمید ورجا کی ایک نمائندگی ہے:

وَلَيْتَكَ تَـرْضَـىٰ وَالْأَنَـامُ غِضَـابٌ	۱	فَلَيْتَكَ تَحْلُوْ وَالْحَيَـاةُ مَرِيْرَةٌ

وَلَيْتَ الَّـذِي بَيْـنِـي وَبَيْـنَكَ عَـامِرٌ	۲	وَبَيْـنِـي وَبَيْـنَ الْـعَـالَـمِيْنَ خَـرَابٌ
إِذَا صَحَّ مِـنْكَ الْـوُدُّ فَـالْكُلُّ هَيِّنٌ	۳	وَكُـلُّ الَّـذِيْ فَـوْقَ التُّـرَابِ تُـرَابٌ

(۱) کاش! کہ آپ اپنے اِس بندے کے حق میں شیریں اور مہرباں ہوں خواہ زندگی تلخ اور بدمزہ ہو، اور کاش! کہ آپ راضی ہوجائیں اور سارے لوگ ناراض رہیں۔

(۲) اور کاش! کہ اِس عاجز اور آپ کے درمیان جو ربط وتعلُّق ہے وہ مُستحکم اور آباد ہو، اور میرے اور تمام عالَم کے درمیان جو علاقہ اور رِشتہ ہے وہ ویران اور شِکستہ ہو۔

(۳) اگر آپ کی طرف سے محبت اور رحمت کا جو رشتہ ہے وہ درست اور مربوط رہے تو پھر کسی چیز کی پرواہ نہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس جہانِ خاکستر پر جو کچھ ہے وہ خاک اور خاکستر ہے''۔) (کاروانِ زندگی ۷/۱۰۷)

پیوستہ رہ شجر سے

''کاروانِ زندگی'' کی تالیف کا سلسلہ شروع کرتے وقت اُس کی افادیت کے پہلوؤں میں سے ایک کی تفصیل آپ نے جس انداز سے فرمائی ہے اُس سے بھی آپ کے تعلق مع اللہ کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے:

''اپنی زندگی کے واقعات اور اپنے ساتھ خدا کا معاملہ دیکھ کر بے ساختہ قرآن مجید کی آیت یاد آتی ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ (حم السجدة آيت: ۵۳)

(ترجمہ: ہم عن قریب اُن کو اَطراف (عالَم) میں بھی اور خود اُن کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دِکھائیں گے، یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہوجائے گا کہ وہ حق ہے، کیا تم کو

یہ کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے؟)۔

حقیر، ذہنی و علمی صلاحیتوں، محدود ماحول، ناسازگار حالات اور قلیل وسائل کے ساتھ رحمتِ الٰہی کی جو کرشمہ سازی اور مُربیِ مُطلَق کی جو بندہ نوازی دیکھی، اُس سے والدین کی دعاؤں کی تاثیر، نیک نیت وسراپا شفقت سرپرستوں کی تعلیم وتربیت، شفیق ولائق اساتذہ کی محنت، خدا کے مقبول بندوں کی نظرِ شفقت، اُن کی دلی مَسرَّت اور قلبی اطمینان کا فائدہ، اور اُن سے اِنتساب اور اُن پر اعتماد کی برکت ظاہر ہوئی، صحیح مقاصد ومشاغلِ زندگی کے انتخاب (جو توفیقِ الٰہی کے بغیر ممکن نہ تھا) حد درجے کی کمزوری، ہمت کی پستی اور طبیعت کی اَفسُردگی کے باوجود چند اصولوں کی پابندی اور ع ''پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ'' پر عمل کی کوشش کا ثمرہ کھلی آنکھوں دیکھا۔ خیال آیا کہ اپنی زندگی کی حقیر کہانی کے ذیل میں اگر یہ حقائق پڑھنے والوں کے سامنے آئیں، تو مَوعِظت وعبرت کا سامان بھی ہوں گے، اور حوصلہ وہمت کی بلندی اور خدا سے اچھی امیدیں رکھنے کا سبب بھی''۔ (کاروانِ زندگی ۱۰/۱)

اسپتال تیماردار کے لیے دار الشفاء

اچانک پیش آنے والے حوادث وواقعات سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو تعلُّق باللہ کی تقویت کا ذریعہ بنانا بھی اُسی ماحول کا اثر ہے جس میں آپ کی تربیت ہوئی تھی۔ اپنے ایک کم سِن عزیز کے آپریشن کے موقعہ پر تیمارداری کی غرض سے رمضان کے مبارک اَیام میں اسپتال رہنا پڑا، اُس وقت آپ کی عمر پندرہ یا سولہ سال کی تھی؛ لیکن آپ نے اِس قیام سے کیا فائدہ اُٹھایا؟ خود آپ کی زبان سے سنیے:

''رات کو مریض کے پاس ہی رہنا ہوتا تھا، عزیز موصوف سب سے زیادہ مجھ سے مانوس تھا؛ اِس لیے مجھ ہی کو آواز دیتا اور تکلیف کی شکایت کرتا، بعض اوقات رات کا

بڑا حصہ جاگنے اور نرسوں کو بلانے میں گزر جاتا، اسپتال کا سارا ماحول انسانی کمزوری، صحت کی بے وفائی اور زندگی کی بے ثُباتی کا منظر اور قوی دلائل پیش کرتا تھا، اِس سے طبیعت میں - جو ابھی پڑھنے لکھنے اور اَدبیات سے مانوس تھی - ایک تغیُّر پیدا ہوا، جس کو ''اِنابت'' سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اِس قیام نے - جو ایک طرح کا مُجاہَدہ بھی تھا - ایک خانقاہی ماحول اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا، طبیعت میں اپنی اصلاح و ترقی اور تعلُّق باللہ کا ایک ہلکا سا شعور پیدا ہوا، اِسی حالت میں عید آئی جو بڑی مسافرانہ حالت میں گزری، اِن سب حالات نے قلب و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ عزیز موصوف الحمدللہ صحت یاب ہوکر تو نکلے ہی، اسپتال خود تیماردار کے لیے ایک دار الشفاء بن گیا۔ (کاروانِ زندگی ۱/۱۱۵)

کیفیاتِ باطنی کا حظِّ وافر

اِسی تعلُّق مع اللہ کے نتیجے میں اِنابت اِلی اللہ، توکُّل علی اللہ، زُہد اور دنیا سے بے رغبتی کی کیفیت قلب میں پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اِن کیفیاتِ باطنی کا حظِّ وافر حضرت مولاناؒ کو عطا فرمایا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تبلیغ و دعوت کی غرض سے آپ کا قِیام چھ ماہ کے لیے حجاز میں رہا، آپ کا یہ سفر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مشورے سے طے پایا تھا، اِس سفر میں آپ کے ساتھ آپ کی والدہ صاحبہ، آپ کی اہلیہ محترمہ، آپ کے بڑے بھانجے: مولانا محمد ثانیؒ، اور آپ کی ہمشیرہ صاحبہ اَمَۃُ اللہ تسنیم صاحبہ تھیں۔ اِس زمانۂ قیام میں حج و زیارت کی سعادت کے ساتھ آپ کا پورا وقت دعوت و تبلیغ میں گزرا، اِسی زمانۂ قیام کی مختصر روئیداد ''کاروانِ زندگی'' حصہ اول صفحہ ۳۳۸ تا ۳۴۰ میں آپ نے تحریر فرمائی ہے۔ حجاز کے اہلِ علم اور اکابر سے اُس زمانے میں رَبط و تعلُّق پیدا ہوا، جن میں علامہ سید علوی مالکیؒ، شیخ امین کتبیؒ، شیخ حسن مَشّاطؒ، شیخ ابن عربیؒ، شیخ محمود شوبلؒ، شیخ عبدالرزاق حمزہؒ

وغیرہ ہیں، اِن میں ایک شخصیت شیخ عمر بن الحسن آل شیخ کی بھی ہے، اِس کی تفصیل خود حضرت مولانا کے الفاظ میں سنیے:

''مکۂ معظّمہ کے طویل قِیام کا ایک بڑا ثمرہ شیخ عمر ابن الحسن آل الشیخ سے تعارُف اور اُن کے اُنس واعتماد کا حصول ہے، جو دعوت وجماعت کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد میں تھے، قاضی القُضاۃ اور شیخ الاسلام مملکتِ سعودیہ شیخ عبداللہ بن الحسن (جو مملکت کی سب سے بڑی دینی شخصیت تھے) کے وہ حقیقی بھائی اور ''ریاض'' کی ہیئتِ امر بالمعروف اور نہی عن المنکَر کے رئیس تھے، وہ ولیٔ عہد مملکت امیر سعود کے بڑے مُعتَمد اور مُشِیر تھے، اور اُن کو مِن جانب اللہ مجھ سے ایک خاص تعلُّق پیدا ہوگیا، میرے رسائل پڑھتے اور پڑھوا کر سنتے، اُن کے اِس تعلُّق اور اعتماد نے اُن لوگوں کی باتوں کو بے اثر بنادیا (جو مختلف اسباب کی بنا پر) جماعت کے بارے میں بدگمانی اور شکوک پیدا کرتے تھے، اور مختلف اَفواہیں اڑاتے تھے، شیخ عمر کو اِس بارے میں اِتنا اطمینان پیدا ہوگیا کہ، اُنھوں نے کھل کر جماعت کی حمایت اور بارہا اُس کی طرف سے مُدافَعت کی۔ ظاہری اَسباب کے لحاظ سے اگر شیخ عمر کا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید جماعت کے لیے آزادی سے وہاں کام کرنے اُس وقت موقع جاتا رہتا، اُن کا یہ تعلُّق اُن کی آخر عمر تک قائم رہا''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۳۳۹)

لاتَزَالُ أُمَّةُ مُحَمَّدٍ عَلَى الْخَيْرِ

اِن ہی شیخ عمر آل الشیخ کے ساتھ پیش آیا ہوا ایک واقعہ حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحبؒ کی زبان سے سنیے، فرماتے ہیں:

''اُنھوں نے ایک روز مجھ سے حَرَم میں فرمایا کہ: صبح میرے پاس آنا، اُن کے

حکم کے مطابق حاضر ہوا، تو ایک تھیلی سونے کی گِنّیوں سے بھری دی، اور کہا کہ: شیخ ابوالحسن کو پہنچادو، اُس زمانے میں نوٹ کا چلن نہیں ہوا تھا، یا تو چاندی کے رِیال چلتے تھے یا چالیس رِیال قیمت کی ایک طَلائی گِنّی (جس کو ''جُنَیِّہ سعودی'' کہا جاتا تھا) مَیں نے ایک تھیلی سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی، اُس کو لے کر ایک طرح کی خوشی کے ساتھ ''رَباط'' آیا، حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کی، غالباً ۴۵؍ منٹ یا ایک گھنٹہ بعد مولانا نے ایک خط لکھا، اور تھیلی کے ساتھ مجھ کو دیا، کہ شیخ کو دے آؤ۔ اُس خط میں شکریے کے جذباتِ احترام کے اظہار کے بعد لکھا تھا کہ: ''ہدیہ قبول ہے، اور مَیں نے ایک گنی اپنے ذاتی خرچ کے لیے رکھ لی ہے، بقیہ واپس کر رہا ہوں'' (بقیہ ۳۹ گنیاں)۔ مَیں یہ رقم اور خط لے کر گیا تو شیخ ظہر کے بعد آرام کر رہے تھے، ملاقات نہ ہوسکی، بعد عصر گیا تو وہاں پورا ہال بھرا تھا، قَہوہ کا دَور چل رہا تھا، سلام کر کے خط اور رقم کی تھیلی حاضر کی، شیخ نے پہلے خط پڑھا، پھر آواز سے اُسے پڑھ کر سب کو سنایا، ایک صاحب نے کہا کہ: ''عُلمائے سَلَف کے نمونے ہر زمانے میں مل جاتے ہیں''۔ ایک اَور صاحب بولے: لَاتَـزَالُ أُمَّةُ مُـحَـمَّـدٍ عَلَى الْخَيْـرِ (رسول اللہ ﷺ کی اُمّت میں ہمیشہ خیر رہا ہے)۔ پچاس برس پہلے کی بات ہے، اُن لوگوں نے نجدی لہجے میں اَور کیا کہا؟ یاد نہیں؛ لیکن اِتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ: مولانا کے اِس اِستغناء سے ہندوستان کے عُلما کا وَقار بڑھ گیا، اور محسوس کیا گیا کہ سب یکساں نہیں ہوتے۔ مَیں سمجھا تھا کہ بات ختم ہوگئی؛ مگر عرصۂ دراز کے بعد شیخ عمر بن حسن کے برادر زادہ شیخ حسین بن عبداللہ آل شیخ (جو بعد میں وزیرِ تعلیمِ اعلیٰ ہوئے) سے بیروت میں اُستاذ عبداللہ الغنیم کے مکان پر ملاقات ہوئی، تو اُنھوں نے مولانا کی خیریت معلوم کی، اور اِس واقعے کو میری موجودگی

میں عبداللہ الغنیم کو سنایا''۔(میر کارواں ص:۵۵)

وہ تھیلی بھی واپس کی گئی

اُسی زمانے کا ایک اَور واقعہ ڈاکٹر صاحب مدظلہم کے الفاظ میں سنیے:

''اُسی زمانے کا دوسرا واقعہ امیر سعود الکبیر (بادشاہ کے چچا) کے ہدیے کا ہے، موصوف نے مولانا اور اُن کے مُرافقین کی دعوت کی، کھانے اور چائے کے بعد واپس آنے لگے، تو مولوی رضوان علی صاحب (حال ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی مقیم کراچی) کو اشارے سے روک لیا، اور اُن کے ساتھ چاندی کے ریالوں کی بڑی تھیلی جس میں پانچ سو ریال تھے اُن کے حوالے کی، اور کہا: اپنے شیخ کو دے دینا، وہ تھیلی بھی واپس کی گئی''۔(میر کارواں ص:۵۵،۵۶)

قلندرانہ فیصلہ

دِمشق یونیورسٹی میں جب ''كلية الشريعة'' کھلا، تو اُس کا پرنسپل عالمِ عرب کے معروف عالم ومحقِّق ڈاکٹر مصطفیٰ السّباعی کو مقرَّر کیا گیا، اُس موقع پر اُنھوں نے حضرت مولانا کے نام ایک خط لکھا، جس میں آپ کو اُس میں بہ حیثیتِ استاذ تدریسی ذمّے داری سنبھالنے کی دعوت پیش کی گئی، دعوت اور اُس کا جو جواب آپ نے دیا وہ آپ ہی کے الفاظ میں پیش ہے:

''اُنھوں نے اُس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ: کالج کی کمیٹی نے میرے ذمّے یہ خدمت سپرد کی ہے کہ، مَیں آپ تک اُس کی یہ خواہش ودرخواست پہنچادوں کہ: آپ دو سال یا ایک سال کے لیے اِس میں تدریس کی ذمّے داری قبول کرلیں اور یہاں آنا منظور کرلیں، اِس سلسلے میں آپ کے جو شرائط ومُطالَبات ہوں اُن سے مُطَّلع کریں۔ اُس خط

پر ۲۲؍شوال ۱۳۷۴ھ، ۱۲؍جون ۱۹۵۵ء کی تاریخ اور عمیدِ کُلّیۃ الشریعۃ (شریعت کالج کے پرنسپل) کی حیثیت سے اُن کے دستخط تھے۔ مَیں نے اُس خط کے جواب میں اُن کو اِس کامیابی پر مبارک بادی اور بہ حیثیتِ باضابطہ استاذ کے اُس اسٹاف میں شریک ہونے اور سال دو سال اپنے مُستقَر (ہندوستان) سے (جہاں کام کا بڑا میدان اور مسلمانوں کی بڑی ذمّے داری ہے) دُور رہنے سے تو معذرت کی''۔ (کاروانِ زندگی ۱؍۴۱۹)

اِس واقعے پر تبصرہ فرماتے ہوئے مولانا ممشاد علی قاسمی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا کا دمشق یونیورسٹی کی ملازمت سے انکار اِس لیے اَور بھی تعجب خیز ہے کہ، حضرت کا وہ معاشی تنگی کا دَور تھا، ندوۃ العلماء سے تنخواہ لینی مدت سے بند کی ہوئی تھی، دوسرا بھی کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہ تھا، معاشی حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ اِس واقعے سے بھی ہوسکتا ہے جو کچھ دنوں پہلے گزر چکا تھا، اور خود حضرت مولانا نے اُس کو اپنے قلم سے اِن الفاظ میں نقل کیا ہے کہ:

''مجھے یاد ہے کہ: ایک مرتبہ امین آباد کے چوراہے پر نظیر آباد جانے والی سڑک کے کنارے پر کھڑے ہوکر مَیں نے جیب سے کئی مرتبہ گھڑی نکالی، کہ اِس کو کسی گھڑی کی دکان پر آدھے پونے دام پر بیچ دوں، اُس سے کچھ دن کام چلے؛ لیکن پھر اِس خَیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ کہیں دکان دار چوری کی نہ سمجھے''۔ (کاروانِ زندگی ۱؍۳۲۴)

اِس تنگی اور پریشانی کے دَور میں اِتنی بڑی تنخواہ (جو تیرہ سو روپئے مع دیگر جملہ سہولیات تھی، جو حضرت کے ذرا سے اشارے سے اُس سے کہیں زیادہ بھی ہوسکتی تھی۔ ۱۳۰۰؍روپئے ۱۹۵۵ء میں خاصی رقم تھی۔) آرام اور آسائش پر مدرسے کی سادہ زندگی اور رَضا کارانہ دینی، تبلیغی ودعوتی خدمات کو ترجیح دینا، ایک ایسا قلندرانہ فیصلہ تھا جس کی

توجیہ اِس کے عِلاوہ اَور کوئی سمجھ میں نہیں آتی کہ، یہ کوئی غیبی طاقت اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت اور راہنمائی تھی جس نے آپ کو یہ جُرأت وحوصلہ دیا''۔(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی اکابر ومشائخ کی نظر میں ص:۱۷۶)

مدینہ یونیورسٹی کی پیش کش

مدینہ یونیورسٹی کا جب قِیام عمل میں آیا اُس وقت بھی اِسی نوع کا ایک واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا، حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مارچ ۱۹۶۲ء کی آخری تاریخوں میں علی گڑھ موتیابندھ (CATARACT) کے ایک چھوٹے آپریشن کے لیے گیا ہوا تھا، اور گاندھی ہاسپٹل میں داخل تھا کہ، مملکت سعودیہ کے سفیر عالی مَرتبت شیخ یوسف الفوزان ملنے کے لیے آئے؛ لیکن صحیح رہبری نہ ہونے کی وجہ سے مجھ تک نہ پہنچ سکے، جب مَیں فارغ ہوکر لکھنؤ آیا تو اُن کا خط ملا کہ، آپ کے لیے ایک اہم اور محترم پیغام ہے، آپ یا تو دہلی آنے کی تکلیف کریں یا اپنا کوئی معتَمَد بھیج دیں۔ مَیں نے عزیزی محمد رابع سلّمہٗ کو اِس کام پر مامور کیا، سفیر صاحب نے بتایا کہ: مملکت سے مولانا کی دعوت کا خط آیا ہوا ہے، مدینۂ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا ہے، ہماری حکومت چاہتی ہے کہ مولانا وہاں تدریسی خدمت قبول کریں''۔(کاروانِ زندگی ۱/۲/۲۷۲، ۲۷۳)

اِس کے حاشیے میں حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''کئی سال بعد جامعہ اسلامیہ کے امینِ عام (رجسٹرار) شیخ محمد ناصر العبودی نے بتایا کہ: یہ شاہ سعود کا ذاتی خط تھا جو اُنھوں نے میرے نام لکھا تھا، وہ عام طور پر کسی کو ذاتی خط نہیں لکھتے؛ لیکن اُنھوں نے اِس موقع پر یہ خصوصیت برتی تھی''۔(ایضاً)

اِس کا جواب بھی حضرت مولاناؒ نے وہی دیا جو دمشق یونیورسٹی کی پیش کش کے موقع پر دیا تھا؛ البتہ جُزوی و عارضی خدمت کے لیے آمادگی ظاہر فرمائی، کچھ عرصے کے بعد آپ کو اِطّلاع دی گئی کہ، آپ کو جامعہ اسلامیہ کی مجلس اِستشاری کا رُکن بنایا گیا ہے، اُس کا پہلا اِجلاس ذوالحجہ کے تیسرے ہفتے ''مدینہ'' میں ہوگا، اِس کے متعلِّق حضرت مولاناؒ تحریرفرماتے ہیں کہ:

''مَیں نے اِس کو لطیفۂ غیبی اور اپنے حق میں ایک نعمت اور بشارت سمجھا، سب سے پہلے تو حضرت شیخ الحدیث (مولانا محمد زکریا صاحبؒ) سے مشورہ اور حضرت رائے پوریؒ سے اجازت لی، حضرت نے بہ خوشی اجازت دی، مَیں نے اپنی منظوری کی اطلاع دے دی''۔ (کاروانِ زندگی ۱؍۳۴۷)

یہاں یہ چیز بھی قابلِ توجُّہ ہے کہ، اِس پیش کش کی منظوری کے لیے بھی حضرت مولاناؒ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مشورے اور اپنے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی اجازت کو ضروری سمجھا، حضرت مولاناؒ کے اِس طریقۂ کار میں طبقۂ اہلِ علم کے لیے بہت بڑا درس ہے۔

فیصل ایوارڈ اور مولانا کی بے نیازی

۱۹۸۰ء میں حضرت مولانا کو فیصل ایوارڈ کا اعزاز ملا، اِس کی تفصیل خود حضرت مولاناؒ کے الفاظ میں سنیے:

''مَیں اپنے مردانہ قِیام گاہ (دائرۂ شاہ علم اللہ، رائے بریلی) کے بالاخانے پر بیٹھا ہوا اپنے معمول کے مطابق تحریری تصنیفی کام کررہا تھا، کہ عزیزی محمد رابع سلّمہٗ لکھنؤ سے آئے، اور اُنھوں نے اِطّلاع دی کہ: آپ کے لیے فیصل ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے، اور

اطلاع اور مبارک باد کے یہ تار آئے ہیں۔ اُن میں ایوارڈ کمیٹی کے صدر امیر خالد فیصل بن عبدالعزیز کی طرف سے اِطّلاع کا تار اور ریاض آ کر اُس کو وصول کرنے کی دعوت تھی۔ مبارک باد کے تاروں میں سب سے پہلا تار حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا تھا، اُن کو جب ریڈیو کے حوالے سے مدینۂ طیبہ میں ایک صاحب کے ذریعے اِس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ: علی میاں کو فوراً مبارک باد کا تار دے دو، کہ اُن سے اندیشہ ہے کہ وہ اِس کے قبول کرنے سے معذرت نہ کر دیں، وہ میرے اِس تار سے میرا اِیماء سمجھ لیں گے''۔ (کاروانِ زندگی ۲/۲۹۴)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ) کے اِس جملہ ''اُن سے اندیشہ ہے کہ وہ اِس کے قبول کرنے سے معذرت نہ کر دیں'' سے حضرت مولاناؒ کے مزاج اور ایسے اُمور سے آپ کی بے رغبتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اہلُ اللہ دلوں کے باطنی اَمراض واَحوال سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں، ایک شیخِ وقت کا یہ جملہ حضرت مولانا کے قلب میں حُبِّ جاہ کا شائبہ تک نہ ہونے کی شہادت دیتا ہے، اِسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ اُس ایوارڈ کو وصول کرنے کے لیے خود تشریف لے جانے کے بہ جائے اپنے ایک معتَمَد ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندویؒ کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا، حالاں کہ مملکتِ سعودیہ کے وزیرِ تعلیم معالی الشیخ حسن عبداللہ آل الشیخ کا ایک خصوصی اور پُرزور تار آپ کے نام گیا تھا کہ: آپ میری خاطر اِس جلسے میں ضرور شریک ہوں۔ اِس موقع پر انتخاب کمیٹی کے صدر کے نام آپ نے جو خط لکھا، اُس میں تحریر فرماتے ہیں:

''بہتر تو یہ تھا کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو اُن کا انعام دنیا سے جانے کے بعد ملے؛ لیکن میری لاعلمی میں اِس کا اعلان ہوا، اب میرے لیے ملک فیصل مرحوم (جن

سے اِس انعام کا انتساب ہے) کی عظیم اسلامی خدمات کے اعتراف واحترام میں اِس کے سِوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس کو قبول کرلوں‘‘۔

اِسی خط میں آگے تحریر فرمایا کہ:

’’یہ ایوارڈ دو پہلوؤں کا حامل ہے: ایک اُس کی معنوی قیمت یعنی اعزاز واعتراف، اِس کو میں شرمندگی کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ دوسرا اُس کا مالی پہلو، یعنی وہ رقم جو اِس کے ساتھ ملے گی، اُس کے لیے مَیں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ مَیں اُس کو اپنی صواب دید کے مطابق اسلام کے مَفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صَرف کروں، جس کا اعلان مولوی عبداللہ عباس ندوی کریں گے‘‘۔

چناں چہ اِس کے لیے جو اجلاس خصوصی طور پر منعقد کیا گیا تھا اُس میں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے ایوارڈ وصول کیا، اور آپ کا خط بھی پڑھ کر سنایا، اور اعلان کیا کہ: نصف رقم اَفغان پناہ گزینوں کے لیے، ایک رُبُع جماعتِ تحفیظ القرآن الکریم کے لیے جس کے شیخ صالح القزّاز (سابق سکریٹری جنرل رابطۂ عالَمِ اسلامی) نگراں ہیں، اور دوسرا رُبُع مدرسہ صولتیہ مکۃ المکرّمہ کے لیے ہے۔ دوسرے انعام پانے والے (جن میں علمی وادبی خدمات اور تحقیقی کاموں پر ایوارڈ وصول کرنے والے تھے) بہ ذات خود موجود تھے، اور اُنھوں نے انعام وصول کیے۔ (ماخوذ از: کاروانِ زندگی ۲/۲۹۵،۲۹۶)

اِس ایوارڈ کی رقم دو لاکھ سعودی ریال تھی، جس میں سے ایک حَبَّہ بھی آپ نے نہیں لیا، ایسے واقعات تاریخِ انسانی میں خال خال نظر آتے ہیں۔

ایک عظیم ایوارڈ

۱۹۹۸ء میں دُبئی کے بین الاقوامی جائزۂ قرآن کے سرکاری ادارے جس کی

صدارت ولیٔ عہد دبئی ووزیرِ دِفاع، اِماراتِ عربیہ متّحدہ محمد بن راشد آلِ مکتوم کرتے ہیں، اِس سال کی عالمِ اسلام کی ممتاز علمی واسلامی شخصیت کی حیثیت سے حضرت مولاناؒ کو یہ گراں قدر ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا، اور اِس کا اعلان بینَ الاقوامی سطح پر کردیا گیا، حضرت مولاناؒ کو پہلے سے اِس کا علم نہیں تھا، اور اِس کا اعلان بینَ الاقوامی سطح پر ہوجانے کی وجہ سے انکار کی بھی گنجائش نہیں تھی، ایوارڈ پیش کرنے کے لیے جائزہ کمیٹی کا بینَ الاقوامی سطح پر اجلاس طے ہوا، تو حضرت مولاناؒ نے اِس ہنگامہ خیز وپُرشوکت مجلس سے بچنے کے لیے سفر سے معذرت کردی اور اپنی خرابیٔ صحت کا بہانہ بھی پیش کیا، وہاں سے جواب دیا گیا کہ: سفر کی سہولت کے لیے مملکت کا ایک مخصوص ہوائی جہاز لکھنؤ کے ہوائی اَڈے پر بھیجا جائے گا، اور ایک ڈاکٹر بھی ہمراہ بھیجا جائے گا، پھر بھی حضرت مولاناؒ نے اپنی معذرت جاری رکھی؛ لیکن جب حکومتِ دبئی کی طرف سے یہ کہا گیا کہ: حضرت مولاناؒ کے نہ آنے سے حکومت کی بدنامی اور بے عزتی ہوگی، تو مجبوراً آپ نے سفر کا فیصلہ کیا، وہاں ایوارڈ دینے کے لیے ایک عظیم الشان اجلاس کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت ولیٔ عہد دبئی شیخ محمد بن راشد نے کی، اور ایوارڈ دینے کے لیے جب آپ کا نام پکارا گیا تو تمام حاضرین نے احتراماً اپنی نشستوں سے اُٹھ کر خیر مَقدم کیا، ایوارڈ کا جب اعلان کیا گیا تو حضرت مولانا نے اُس کی پوری رقم ہندوستان اور مختلف اسلامی ممالک میں دینی تعلیم کے لیے مشغول ومخصوص اداروں کو بہ طورِ عطیہ واِعانت صَرف کرنے کا اعلان کیا۔ (ماخوذ از: کاروانِ زندگی ۲۲۱/۷)

انعام کی یہ رقم ایک مِلین (دس لاکھ) درہم کی تھی، جس کی قیمت ہندوستانی سکے میں ایک کرُوڑ ہوتی ہے، حضرت مولاناؒ نے اُس میں سے ایک پائی بھی اپنے یا افرادِ خاندان کے لیے نہیں رکھی۔

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

حکومتِ ہند کا اعزازی خطاب ’’پدم بھوشن‘‘ دینے کی خواہش کا اظہار دو دو مرتبہ وقت کے وُزرائے اعظم کی طرف سے کیا گیا، اور اُس کو قبول کرنے کے لیے آپ سے درخواست کی گئی؛ لیکن ہر مرتبہ آپ نے یہ کہہ کر معذرت فرمادی کہ: مجھے اِس سے مُعاف رکھا جائے، یہ میرے اصول اور روایات کے خلاف ہے۔ (کاروانِ زندگی ۵/۶۴)

ع کہ عَنقا را بلند ست آشیانہ

آپ کی مبارک زندگی ایسے حالات و واقعات سے بھری پڑی ہے، جو آپ کی دنیا سے بے رغبتی اور زہد وقناعت کے شاہدِ عدل ہیں، یہ تو چند بڑے واقعات نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

بے نفسی

کمالات واوصاف کا مجموعہ ہونے کے باوجود کبھی اپنے کسی وصف اور کمال پر غرور اور عجب تو کیا معنیٰ؟ کسی مناسب موقع پر اُس کا اظہار کرنے سے بھی عموماً آپ بچتے رہے، تواضع وانکساری اور خاکساری وبے نفسی بھی آپ میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ع ’’نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمین‘‘ کے آپ حقیقی مصداق تھے۔

حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب نے بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ:

’’ہم معمولی معمولی اعزازات ملنے پر آپے سے باہر ہوجاتے ہیں؛ بلکہ بسا اوقات اُس کے حصول کے لیے اپنے ضمیر ودِین وملّت کا سودا کر لیتے ہیں؛ مگر مولاناؒ کے دل ودماغ پر اِن اعزازات کا نہ تو کوئی منفی اثر پڑا، اور نہ اُن کی فقیرانہ زندگی پر کوئی اثر دِکھائی دیا، اور نہ اِس کے ذریعے کسی وَجاہت حاصل کرنے کا وَہم اُن کے حاشیۂ خَیال میں پیدا ہوا؛ بلکہ

وہ اِن اعزازات کے تذکرے کو بھی زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ (ماہنامہ الرشاد، شمارہ: ۲۲۵)

شیخ التفسیر کی سند

آپ کے اِس وصفِ خاص کی شہادت آپ کے اوّلین شیخ ومرشد حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے آپ کے نام اپنے ایک مکتوب میں دی ہے، پہلے اُس کو نقل کرتا ہوں، اِس کے بعد چند واقعات پیش کروں گا:

(از احقر الانام احمد علی عفی عنہ)

محترم المقام مولوی ابوالحسن صاحب بارك الله في اخلاصكم وأعمالكم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

آپ کا ملفوف وصول پایا، حالات سے اِطلاع پا کر سرور حاصل ہوا، آپ کا خط پڑھ کر ایک حدیث شریف یاد آئی: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْراً وَّفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْراً (اے اللہ! مجھے میری نظر میں چھوٹا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بنا دے)۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ آپ کی تحریر سے اِس حدیث پر عمل کی توفیق کی خوشبو آ رہی ہے، چوں کہ مَیں آپ کو اپنا سمجھتا ہوں؛ اِس لیے مجھے اِس خوشبو سے بے حد سرور ہو رہا تھا، میرے دل میں آپ کی جو عزت ہے اُسے ضبطِ تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اِسی محبت اور عزت کا یہ نتیجہ ہے کہ، مَیں نے حج کی رات مسجدِ خَیف میں آپ کے درجات کی ترقی کے لیے بارگاہِ الٰہی سے اِستدعا کی، اور الحمد للہ اُس نے بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پائی۔ مَیں آپ کی اَور زیادہ خدمت کرنا چاہتا ہوں، خدا کرے کہ میری یہ آرزو پوری ہو جائے۔ اپنے حالات سے وقتاً فوقتاً مُطَّلع فرماتے رہے۔ فقط ۲۴ر فروری ۱۹۴۷ء

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابر ومشاہیرِ اُمَّت کی نظر میں: ۸۴)

اَیاز قدرِ خود را بشناس

حضرت مولاناؒ کے لیے جب فیصل ایوارڈ کا اعلان کیا گیا، اُس کے کچھ ہی دن کے بعد ''دارالمُصنّفین'' کی انتظامیہ کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا، ناظمِ دارالمصنفین مولانا سید صَباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اِس موقع پر ایک تہنیتی جلسہ منعقد فرما کر حضرت مولاناؒ کی خدمت میں سِپاس نامہ پیش کرنے کا پروگرام بنالیا، جس کا علم آپ کو اعظم گڑھ پہنچ کر ہوا، اِس کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ رقم طراز ہیں:

''جب مَیں وہاں پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر شرمندگی ہوئی کہ اُنھوں نے اَز راہِ محبت وتعلُّق اِس کا خاصا اہتمام کیا ہے، اور قُرب وجَوار کے علَما اور معزّزینِ شہر کو دعوت دی ہے، سپاس نامے میں بھی اُنھوں نے اپنے اَدیبانہ اور پُر زور قلم سے وہ سب کچھ لکھا جو اُن کے خلوص ومحبت نے لکھوایا۔

مَیں شکریہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو مَیں نے اپنی تقریر کا آغاز محمود وایاز کے اُس قصے سے کیا جس کا ایک فِقرہ ''ایاز قدرِ خود را بشناس'' ضربُ المثل کی طرح مشہور ہوگیا ہے۔ مَیں نے کہا کہ: جب سلطان محمود غزنوی کے اہلِ دربار ومُقرَّبانِ خاص نے دیکھا کہ، بادشاہ کا ایاز پر (جو ایک غلام تھا) وہ اِلتِفات اور نظرِ خصوصی ہے جو اُن میں سے کو حاصل نہیں، تو اُن کو حسد پیدا ہوا، اور اُنھوں نے موقع دیکھ کر سلطان سے عرض کیا کہ: جہاں پناہ اِس غلام پر بہت اعتماد فرماتے ہیں اور اِس کو بارگاہِ سلطانی میں تقرُّبِ خاص حاصل ہے، ہم کو اُس کی وفاداری میں شک ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ، وہ مجلسِ شاہی سے اُٹھ کر اپنے خَلوت خانے میں جاتا ہے اور کچھ دیر وہاں ٹھہر کر چلا آتا ہے، جہاں پناہ کو اِس کی تحقیق کرلینی چاہیے کہ وہ خلوت میں کیا کرتا ہے؟ بادشاہ کو بھی بار بار کہنے سے خَیال پیدا

ہوگیا، ایک مرتبہ ایاز خلوت خانے میں جانے لگا تو بادشاہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے پہنچا، دیکھا کہ وہاں ایک پُرانی گدڑی (دَلق فقیرانہ) رکھی ہوئی ہے، ایاز اُس کے سامنے کھڑا ہوا اور کئی بار یہ فِقرہ کہا: ''ایاز! قدرِ خود رابشناس، اَیاز! قدرِ خود رابشناس''، جب وہ اِس وظیفے سے فارغ ہوا تو بادشاہ نے اُس سے پوچھا کہ: تم یہاں کیوں آتے ہو؟ اور اِس فِقرے کا کیا مطلب ہے؟ اَیاز نے عرض کیا کہ: ولیٔ نعمت! مَیں جب دربارِ عالی میں آیا تھا تو گدایانہ وفقیرانہ آیا تھا، اور یہی گدڑی میرے جسم پر تھی، مَیں چاہتا ہوں کہ اپنی حقیقت نہ بھولوں اور مجھے یاد رہے کہ، مَیں کس حال میں آیا تھا اور نگاہِ خسروانہ نے مجھے کہاں تک پہنچادیا؟ اِس لیے مَیں اِس کے سامنے کھڑا ہوکر اپنا ماضی اور اپنی اصل حیثیت یاد کرلیتا ہوں؛ تاکہ میرا دماغ نہ بہکے اور مَیں خود فریبی میں مبتلا نہ ہوں۔

مَیں نے کہا کہ: مَیں نے بھی اپنی پُرانی گدڑی (ابتدا کی بے نوائی اور بے حقیقتی) محفوظ رکھی ہے، اور مَیں بھی اُس کو سامنے رکھ کر ''ایاز! قدرِ خود رابشناس'' کہہ لیا کرتا ہوں۔ یہ گدڑی یہ ہے کہ، مَیں ۱۹۳۱ء میں جب اپنے استاذ علامہ تقی الدین الہلالی کے ساتھ خادمانہ یہاں حاضر ہوا تھا، تو مَیں نے اُن کے ذریعے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ، مجھے یہاں کم سے کم مُشاہَرے پر (جس کی مقدار میرے نزدیک ۲۵، ۳۰ روپیے بھی ہوسکتی تھی) رکھ لیا جائے، اور مَیں کوئی خدمت انجام دوں؛ لیکن مَیں اُس وقت اِس کا بھی اہل نہیں سمجھا گیا، آج اُسی عظیم ادارے کی طرف سے میری یہ پذیرائی اور عزت اَفزائی ہورہی ہے؛ لیکن الحمدللہ مَیں اپنی حقیقت سے واقف ہوں، مجھے اپنا ماضی یاد ہے، اور مَیں اپنے بارے میں کسی فریب میں مبتلا نہیں؛ اِس لیے اپنے نفس کو مخاطَب کرکے مَیں اب بھی کہہ رہا ہوں: ''ایاز! قدرِ خود رابشناس، ایاز! قدرِ خود رابشناس''، اور

اِسی میں اپنی حفاظت اور سلامتی سمجھتا ہوں۔ (کاروانِ زندگی ۲/ ۲۹۷ تا ۲۹۹)

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ

دبئی کے بین الاقوامی جائزۂ قرآن کے سرکاری ادارے کی طرف سے جو ایوارڈ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اُس میں بہ درجۂ مجبوری آپ کو شرکت کرنی پڑی، تقسیم جوائز کے اجلاس میں آپ کے نام کا اعلان ہوا، اُس کے جواب وشکریہ میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

''یہ ایوارڈ مجھے اِس لیے نہیں ملا کہ مَیں اِس کا حق دار تھا؛ بلکہ یہ مجھ پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کا کرم ہے کہ، ہندوستان کے ایک چھوٹے ضلع ''رائے بریلی'' کے رہنے والے اور برطانیہ کی حکومت اور اُس کے نظامِ تعلیم وفکر کے مُروَّج اور موَثّر ہونے کے زمانے میں پرورش پانے والے کے لیے کوئی یہ پیشن گوئی نہیں کرسکتا تھا کہ: یہ بچہ کبھی اِس بین الاقوامی اور جزیرۃُ العرب سے اِنتساب رکھنے والے ملک کے عالمی انعام کا مستحق ہوگا۔ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَاۤءُ، وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ. (کاروانِ زندگی ۷/ ۱۲۲)

بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اپنے مکاتیب میں حضرت مولاناؒ کو جن عظیم خطابات سے مخاطَب فرمایا ہے، اُس کے متعلِّق تحریر فرماتے ہیں:

''اِس کے بعد پے در پے مولانا کے شفقت نامے جلد جلد آنے لگے، اور اُن میں ایسے خطابات سے نوازا جانے لگا جن کا نقل کرنا بھی دوسروں کے لیے غلط فہمی اور اپنے بارے میں فریبِ نفس پیدا ہونے کا موجِب ہوسکتا ہے؛ اِس لیے جب دسمبر ۱۹۵۲ء میں مکاتیب کا یہ مجموعہ شائع ہوا تو مَیں نے اُن خطابات کو حذف کردیا، کہ ایاز! قدرِ خود را بشناس''۔ (کاروانِ زندگی ۱/ ۲۸۲)

اِس مجموعۂ مکاتیب کا پیش لفظ پڑھیے، تواضع اور بے نفسی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

غلط اندیشی کا شکار نہیں ہوا

دمشق یونیورسٹی کی طرف سے اوّلاً تدریس اور اُس سے معذرت وانکار پر مُحاضَرات پیش کرنے کی جو پیش کش کی گئی تھی، اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے ''کاروانِ زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''مَیں اِس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ، مجھے ایک ترقی یافتہ عرب ملک (شام) کی ایک مؤقّر دانش گاہ کی طرف سے ایسی دعوت آنے پر بڑی مَسرت ہوئی، اور مَیں نے اُس کو ایک علمی اعتماد واعزاز کے مُرادِف سمجھا، مَیں اپنی محدود علمی وذہنی صلاحیت اور اپنی سطح اور حیثیت سے ناواقف نہ تھا؛ اِس لیے الحمدللہ اِس بارے میں کسی خودفریبی اور غلط اندیشی کا شکار نہیں ہوا، مَیں نے اِس کو محض اللہ تعالیٰ کا انعام، والدہ کی دعاؤں کی قبولیت، بھائی صاحب کی شفقت اور اساتذہ کی محنت کا ثمرہ ہی سمجھا؛ لیکن فِطری طور پر اِس سے جو خوشی ہونی چاہیے تھی اُس سے انکار نہیں کرتا۔ اہلِ تعلّق کو بھی اپنے اپنے تعلّق کی بہ قدر اِس سے مسرت ہوئی، اور اُنھوں نے مبارک باد دی۔ یہاں صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے ایک خط کا اقتباس (مؤرخہ ۹/جنوری ۱۹۵۶ء) نقل کیا جاتا ہے، جو اُنھوں نے اخباروں میں اِس خبر کے شائع ہونے پر تحریر فرمایا، اِس کے لفظ لفظ سے اُن کی محبت وخلوص، بےنفسی اور اخلاقی بلندی کا اظہار ہوتا ہے:

''اخبار ''الجمعیۃ'' اِسی کے بعد ''مدینہ'' میں بھی اِس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی جو صدیوں کے بعد ہندوستان کو حاصل ہوا۔ علامہ صفی الدین بدایونی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقع ملا؛ بلکہ صفی ہندی تو خود گئے تھے، اور آپ کو تو وہاں کی حکومت اور جامعہ

نے طلب کیا ہے، وَشَتَّانِ بَیْنَهُمَا. یہ امتیاز آپ کی شخصیت تک ہی محدود نہیں ہے؛ بلکہ سارے ہندی علماء کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ یَالَیْتَ کَثَّرَ اللّٰهُ أَمْثَالَکُمْ فِیْنَا".

(کاروانِ زندگی ۱/۴۲۲)

اِس تحریر میں کہیں بھی عُجب وادِّعاء کا شائبہ تک نہیں ہے؛ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کا انعام ہونے کا صاف صاف اقرار کیا جارہا ہے۔

اِفْتَحِ البَابَ بِیَدِکَ لِنَتَبَرَّکَ

۱۹۹۶ء میں سعودی حکومت کے ذریعے بیت اللہ شریف کی تعمیرِ جدید و مرمّت کا جو کام ہوا، اُس کی تکمیل پر عالَمِ اسلام کے منتخب عُلمائے کرام اور قائدینِ ملّت کی موجودگی میں اُس کی افتتاحی تقریب ہوئی، اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ شرف آپ کو عطا فرمایا کہ، کعبۃ اللہ کا دروازہ آپ کے ہاتھوں کھولا گیا۔ مولانا ممشاد قاسمی نے اِس واقعے کی تفصیل اپنی معلومات کے مطابق اِن الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:

"حضرت مولانا شوقِ زیارت میں حَرم شریف میں حاضر تو ہوگئے؛ لیکن اِژدِحام کی کثرت کے باعث پہلے تو کعبہ سے کچھ دُور کھڑے رہے، اِس کے بعد جو عارضی زِینہ اندر داخلے کے لیے درِ کعبہ پر لگایا جاتا ہے حضرت اُس زینے میں آکر بیٹھ گئے: کیوں کہ شَیبی صاحب (کلید بَردارِ کعبہ) تشریف نہیں لائے تھے۔ یہ شیبی خاندان حضرت عثمان ابن طلحہ رضی اللہ عنہ کا خاندان ہے جن کو خود رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ کی کنجی سپرد فرمائی تھی، اور آج تک یہ مقدّس ومحترم امانت اور عظیم شَرف نسلاً بعد نسلٍ اِسی خاندان میں چلا آرہا ہے، کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ ہو یا عام زائر، جب وہ خانۂ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو

کعبۃ اللہ کا قُفل اور دروازہ کھولنے کی سعادت وعزت اِنھیں کو حاصل ہوتی ہے، اور یہ موروثی اور دائمی سعادت اِن کو براہِ راست دستِ نبوَّت سے عطا ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد شیبی صاحب تشریف لائے، اور سلام دعا کے بعد حضرت مولانا مدظلہم کو (کمر کے پیچھے سے دوسری طرف کی بغل میں ہاتھ ڈال کر) سہارا دے کر احترام سے اوپر لے گئے، اُس وقت تک بھی حضرت کو یہ اندازہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اِس سعادتِ کُبریٰ اور شرفِ عظیم کے لیے قبول فرمالیا ہے، حتیٰ کہ زینے کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اور درِ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر شیبی صاحب نے اچانک خانۂ کعبہ کی مقدّس چابی حضرت مولانا کو پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''أَنْتَ شَيْخُ الْعَالَمِ وَشَيْخُ الْحَرَمِ أَيْضاً، اِفْتَحِ الْبَابَ بِيَدِكَ لِنَتَبَرَّكَ ''، اور یہ کہتے ہوئے چابی کعبہ کی چوکھٹ پر رکھ دی، اور حضرت کو اشارہ کیا کہ دروازہ کھولیں، حضرت مولاناؒ نے یہ مقدّس امانت اپنے امین ہاتھوں میں لی۔ بلاشبہ اُس وقت سعادت وخوش بختی سوسو بار آپ کی بَلائیں لے رہی ہوں گی، بلند اقبالی اور نصیبہ وری دَست بوسی؛ بلکہ قدم بوسی کے لیے بار بار اور ہزار بار مچل رہی ہوگی، یہ مسعود ومبارک ساعت اسلامی تاریخ کے دَرخشاں اور لازوال اَوراق کا باب بن کر ایک ایسے واقعے کی شکل میں محفوظ ہوگئی جس پر خود تاریخ ناز کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ، ایسی ہی شخصیتوں سے تاریخ کا سُہاگ باقی رہتا ہے، اور ایسے ہی واقعات سے تاریخ کا احترام قائم ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابر ومشاہیرِ امت کی نظر میں، ص:۲۰۵)

اِس عظیم الشان اور اہم واقعے کو حضرت مولاناؒ کی روایتی تواضع وبے نفسی کس انداز سے پیش فرمارہی ہے، یہ بھی ''کاروانِ زندگی'' کے حوالے سے سن لیں:

''راقم اپنے رُفقاء: بھائی عثمان صاحب، حاجی عبدالرزاق اور عزیزی بلال کے

ساتھ حَرم شریف میں حاضر ہوگیا، وہ پہلے بیت اللہ شریف سے کچھ دُور کھڑا رہا، پھر داخلے کے مشتاق ومُنتظر مجمع میں شامل ہوگیا، اُس کو برابر خیال رہا کہ اِس اِژدِحام اور ادب واحترام کے مقام میں وہ کیسے یہ سعادت حاصل کر سکے گا؟ اچانک کلید بردارِ کعبہ: شیبی صاحب آئے، اور اُنھوں نے راقم کو اشارہ کیا کہ وہ زینے پر چڑھے، راقم اوپر پہنچا تو اُنھوں نے کلیدِ کعبہ، درِ کعبہ پر رکھ دی، اور اشارہ کیا کہ مَیں دروازہ کھولوں، راقم نے یہ شرف حاصل کیا، اور بیت اللہ میں پہلے داخل ہوا۔ وہاں شاہ سعود کے پوتے سموُ الامیر مشعل بن محمد بن سعود نے راقم سے کہا: دعا کیجیے، راقم نے اپنی بِساط کے مطابق یہ شرف حاصل کیا، جس میں داخل ہونے والوں کا مجمع شامل تھا۔ یہ شرف وسعادت جو اِس ناچیز گنہ گار کو حاصل ہوئی اُس کا مقابلہ دنیا کے بڑے بڑے اعزاز نہیں کر سکتے۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ، وَاللّٰهُ ذُوْ الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (کاروانِ زندگی ٦/٣٣٨)

اِس کے حاشیے پر جو اِضافہ ہے اُس کو بھی سَماعت فرمالیں:

''یہاں اِس کا بھی اظہار کر دینا ضروری اور مناسب ہے کہ، راقم کی بے خبری میں اُس کے ایک کرم فرما نے اِس کو ایک بڑا اشرف سمجھتے ہوئے مکۂ مکرمہ سے لکھنؤ کے ایک مشہور صحافی: محترم حسین امین صاحب کو بہ ذریعۂ ٹیلی فون اِس کی اِطّلاع کر دی، اور یہ خبر ''قومی آواز'' لکھنؤ میں نمایاں طریقے پر شائع ہوگئی، معلوم ہوا کہ، مشہور انگریزی اخبار ''ہندوستان ٹائمز'' (HINDUSTAN TIMES) میں بھی یہ خبر غالباً پہلے ہی صفحے پر شائع ہوئی، اِس کے نتیجے میں راقم کو اُس کی واپسی پر مختلف مقامات سے احباب وقدر دانوں کے مبارک باد کے خطوط ملے، جن کو پڑھ کر وہ شرمندہ بھی ہوا اور اِس عزت پر شکر گزار بھی۔ (کاروانِ زندگی ٦/٣٣٨)

تاکہ ہم لوگ اپنی خامیوں پر غور کرسکیں

حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندویؒ اپنے ساتھ پیش آیا ہوا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، جس سے حضرت مولاناؒ کے کردار کی بلندی اور انتہائی درجہ تواضع کا پتہ چلتا ہے:

''۱۹۷۰ء میں ندوہ میں طلبا نے کچھ لوگوں کی شہ پر اسٹرائک کی، مولانا ناظم تھے؛ شاید اِس لیے اُن کی ذات کو نشانہ بنایا گیا تھا، مَیں بھی طلبا کا حامی تھا، چناں چہ ہنگامی طور پر مجلسِ انتظامیہ کی میٹنگ بلائی گئی، مجھ تک جو اِطلاعات ملی تھیں اُن کی بنا پر مَیں طلبا کا حامی تھا؛ اِس لیے اعظم گڑھ سے ایک سخت تحریر لکھ کر ساتھ لے گیا، کہ اِسے مجلس انتظامیہ میں پڑھوں گا؛ مگر جب مجلسِ انتظامیہ ہوئی اور مولانا نے ایک طویل تحریر پڑھی، اور اُس کا پورا پسِ منظر بیان کیا، تو مجھے پھر اپنی تحریر پڑھنے کی جُرأت نہیں ہوئی؛ مگر جب مجلس ختم ہوئی تو اِس کے بعد مجھ سے تنہائی میں مولانا نے کسی ناگواری کے بغیر فرمایا کہ: ''سنا ہے آپ کوئی تحریر پڑھنے والے تھے؛ مگر نہیں پڑھی، تو اب مجھے دے دیجیے؛ تاکہ ہم لوگ اپنی خامیوں پر غور کرسکیں''۔ اِس جملے سے خَجالت وشرمندگی سے شرابور ہوگیا، اور تحریر دینے کی ہمت نہیں ہوئی''۔ (الرشاد، شمارہ: ۲۲۵)

خلوص

اپنے رفیقِ محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کی وفات پر جو تعزیتی تقریر فرمائی، اُس میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اُن سے بہت کام لیا، حضرت رائے پوریؒ سے بیعت کا تعلّق تھا، وہ فرماتے تھے کہ: قِیامت میں جب اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ: کیا لائے؟ تو مَیں دو آدمیوں کا نام لوں گا: پہلا نام مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا لیا۔ (کاروانِ زندگی ۳۵/۷)

یہاں پر بھی آپ نے بر بنائے تواضع دوسرا نام ذکر نہیں فرمایا؛ کیوں کہ وہ آپ کا تھا، حالاں کہ لوگ بزرگوں کے اِس نوع کے کلمات (جو اپنے سلسلے میں ہوں) موقع بے موقع نقل کرتے رہتے ہیں؛ لیکن حضرت مولاناؒ نے موقع اور ضرورت کے وقت بھی اپنا نام حذف فرمادیا۔

فِروتنی کا سانچہ

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس صاحبؒ نے بالکل درست تحریر فرمایا کہ:

''بڑوں کے اعترافات اور اُن کی تحسین وتوصیف سے مزاج کے اعتدال میں کبھی فرق نہیں آیا، اور نہ اُن کے کہے ہوئے الفاظ کو دہرایا۔ آپ ''کاروانِ زندگی'' کے تمام حصے پڑھ جائیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن الفاظِ تحسین واعتراف کو مولانا نے دعا اور فالِ نیک سمجھا۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ؛ وقت کے اَساطینِ رُشد وہدایت نے آپ کو بلند ترین الفاظ سے یاد کیا؛ لیکن بہ جائے اِس کے کہ طبیعت میں اپنی بَڑائی کا احساس ہو، مزاج کے اندر مزید فِروتنی اور شکستگی پیدا ہوگئی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو سمجھتے ہی نہ ہوں، وہ اپنی مقبولیت، شہرت اور مقام سے بھی واقف ہیں؛ مگر طبیعت کا سانچہ ایسا بنا ہے کہ، عزت ومقبولیت نے آپ کے اندر عُجب، خود پسندی، خودسَتائی، خود نمائی کے بہ جائے فِروتنی، رحم دلی، دوسروں کے احساسات کے احترام کا جذبہ پیدا کردیا۔ کثرتِ ذکر وتلاوت ومعمولات کی پابندی نے سیر چشمی کے ساتھ ساتھ دل شکستگی اِس درجہ پیدا کردی جس سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی حِس ہی ختم ہوگئی۔ (میر کارواں ص:۵۱،۵۲)

تفسیرِ خازن میں راسخ فی العلم کی چار علامات بتلائی گئی ہیں:

دشوار و مشکل ضرور ہے

اَلرَّاسِخُ فِي الْعِلْمِ مَنْ وَجَدَ فِي عِلْمِهٖ أَرْبَعَةَ أَشْيَاءَ: اَلتَّقْوىٰ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ تَعَالىٰ، وَالتَّوَاضُعُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ، وَالزُّهْدُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الدُّنْيَا، وَالْمُجَاهَدَةُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّفْسِ. (خازن ۱/ ۲۵۹)

یعنی اپنے اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تقویٰ، اور اپنے اور لوگوں کے معاملے میں تواضع، اور اپنے اور دنیا کے معاملے میں زُہد و بے رغبتی، اور اپنے اور اپنے نفس کے معاملے میں مجاہدہ۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی میں یہ چاروں اَوصاف علیٰ وجہ الاتم نظر آتے ہیں، اور اِن ہی اوصاف نے آپ کو شُہرت ومقبولیت اور عظمت ومحبوبیت کے بامِ عروج پر پہنچایا۔ حضرت مولاناؒ کی مبارک زندگی پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا، اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا؛ لیکن یہ بات شک وشبہ اور تردُّد سے بالاتر ہے کہ، ہر طرح کی عزت وشہرت اور مقبولیت ومحبوبیت کی جس فضا اور ماحول میں حضرت مولاناؒ نے زندگی گزاری، اُس میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کا جاہ ومال سے اِس درجہ دست کش اور بے رغبت رہنا، اور تواضع و بے نفسی کے صراطِ مستقیم پر اِس مضبوطی سے جمے رہنا ناممکن ومُحال نہیں، تو دشوار ومشکل ضرور ہے۔

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہم کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی جو آپ نے یہیں ''باٹلی'' میں منعقد ایک تعزیتی اجلاس میں کہی تھی کہ:

مولاناؒ نے ایک ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' اپنے قلم سے لکھی، اور ایک دوسری ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' اپنے عمل سے لکھی۔ ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا

عَـاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ، فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ، وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً﴾

(الأحزاب، آیت: ۲۳)

بہرحال! اِس مضمون کو طویل کر کے کہاں تک آپ کا وقت لوں! ع

سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لیے

تجاہُل سا کر کے ٹال گئے

آخر میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے آپ کا جو سراپا تحریر فرمایا ہے، اُس پر مضمون ختم کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ مولانا دریابادیؒ کی یہ تحریر ۱۹۷۳ء (یعنی حضرت مولاناؒ کی وفات سے ۲۶/سال قبل) کی ہے، اِس کے بعد تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو دِین و دنیا کے بڑے بڑے اعزازات سے نوازا، اگر آج مولانا دریابادیؒ ہوتے تو نہ معلوم یہ سراپا کس انداز سے تحریر فرماتے؟۔

''علی میاں مرحوم نہیں، ماشاءاللہ زندہ سلامت ہیں، اور خدا کرے خدمتِ دِین وملّت کے لیے مدّتوں اِس خاکداں کو زندہ وسرسبز رکھیں۔ عمر میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں؛ لیکن علم وفضل میں، سنجیدگیٔ فکر میں، اِخلاص میں، اَخلاق وتقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خَشیّت وطاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل۔ رائے بریلی کے سیدزادے خاندان کے اَور لوگوں سے بھی واقف ہوں، باپ اور بھائی کا کیا کہنا! دونوں نـورٌ عـلـیٰ نورٍ، پاک، صاف، طاہر، مُطہّر مٹی (جو تیمّم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے۔ دوسرے اَعِزَّہ بھی اپنی جگہ قابلِ قدر وقابلِ فخر، یہ اُن تاروں کے جھرمٹ میں آفتاب۔ ندوہ اور دیوبند ماشاءاللہ دونوں کے اکابر سے علمِ دین حاصل کیا، اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے (اور اِنھیں میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں) اخلاق وروحانیت کا

سبق لیا، ذَکاوت وفطانت کے پتلے پہلے سے تھے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے، انگریزی بھی بہ قدرِ ضرورت تحصیل کرلی، اورعربی ادب وانشاء میں تو ہندوستان اور عالَمِ اسلام میں نام پیدا کرلیا ہے۔ خود اردو و شعر وادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے ہوئے شامی ومصری صحافت پر بھی سَیر حاصل نظر کرلی۔ تقریر وحکایت میں ملکۂ روانی تحریر سے بھی زائد۔ میری طرح کاہل وجامد نہیں، ندوہ جیسے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں، اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ: ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ اور مقالات وتصانیف ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹا کھٹ نکلتی چلی آرہی ہیں، اردو اور عربی کے عِلاوہ انگریزی میں بھی؛ بلکہ کسی حد تک ترکی میں بھی۔ زندگی قابلِ داد بھی، قابلِ رشک بھی۔

خود مجھے اپنے معاملے میں بُخل یا تواضعِ بے جا کی شکایت البتہ ہے، ایک بار نہیں، شاید دو ایک بار، اور اشارۃً کنایۃً نہیں، منھ پھوڑ کر پوچھا: حضرت! شاندار مصطلحاتِ تصوُّف کا مفہوم کچھ تو ہم نیاز مندوں پر کھولیے، اور تنازُلِ ستّہ کے چہرے سے نقاب ذرا توسَر کائیے، توجُّہِ باطن سے قلب کو گرمائیے! کچھ جواب نہ ملا، تجاہُل سا کر کے ٹال گئے، ایسا تجاہُل جو دانستہ تغافُل سے کم نہیں۔ اِتنے کام مختلف قِسم کے اپنے سر لے رکھے ہیں، کہ کوئی اُن کی مفصَّل فہرست ہی بنالے تو یہی ایک کمال ہے۔ (مُعاصِرین، ص: ۲۱۷، ۲۱۸)

آخر میں پھر معزَّز سامعین سے اِس سَمع خَراشی پر بہ صد ادب ونیاز مُعافی اور دَرگزر کی درخواست کے ساتھ رُخصت ہوتا ہوں۔

تمت وبالفضل عمت

خطبۂ استقبالیہ

بہ موقع: بارہواں اِجلاس مسلم پرسنل لا بورڈ

بہ مقام: احمد آباد

پیش کردہ:

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ الرَّسُوۡلِ الۡأَمِیۡنِ، وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَأَصۡحَابِہٖ أَجۡمَعِیۡنَ، وَعَلیٰ کُلِّ مَنۡ تَبِعَھُمۡ بِإِحۡسَانٍ إِلیٰ یَوۡمِ الدِّیۡنِ.

جنابِ صدر، باوقار ومعزّز حضرات عُلمائے کرام، رہنمایانِ قوم وملّت اور مسلمان بھائیو!

آج کے اِس بابرکت اور پُرمَسرّت اِجلاس میں تمام مسلمانانِ گجرات خصوصاً اَہالیانِ احمد آباد اور اراکینِ مجلسِ استقبالیہ کی طرف سے آپ تمام حضرات کا خلوصِ دل سے خیر مَقدم کرتا ہوں۔ أَھۡلاً وَّسَھۡلاً وَّمَرۡحَباً.

آج کا دن ہمارے لیے مَسرّت وسعادت کا دن ہے کہ، ملتِ اسلامیہ ہند کی مقتدَر اور رہنما ہستیوں اور عُلما وقائدین کے اِس کاروان نے ہماری سرزمین کو اپنے قدومِ مَیمنت لزوم سے نوازا ہے:

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید		کہ سایہ برسرش اَنداخت چوں تُو سلطانے

ساتھ ہی صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں کہ، آپ حضرات نے اپنی گوناگوں اور قیمتی مصروفیتوں اور گراں قدر ذمّے داریوں سے وقت نکال کر یہاں تشریف آوری کی زحمت گوارا فرمائی، اور سفر وموسم کی صعوبتوں اور عمر وصحت کے تقاضوں اور کاموں کے تنوُّع کے باوجود ہمیں میزبانی کا شرف عطا فرما کر اجلاس کی رونق کو دوبالا فرمایا۔ حق تعالیٰ آپ کی اِس تشریف آوری کو ہندوستان کی اُمّتِ مسلمہ کے لیے مفید سے مفید تر بنائے۔ آمین

محترم حضرات! اِس وقت ہم جس سرزمین پر جمع ہیں اُس کا بھی کچھ ذکر ہوجائے یہ ضروری ہے: اللہ تعالیٰ نے سرزمینِ گجرات کو بہت سی خوبیوں اور امتیازی اوصاف سے نوازا

ہے، گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، اربابِ ہنر کا گہوارہ، ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اور ایک سرگرم تجارتی منڈی رہا تھا، رُوحانی اور مادّی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں، بعض اعتبار سے تو قُرونِ وُسطیٰ کی تاریخ میں اِس کو پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، ہندوستان کا یہی وہ علاقہ تھا جس کے سرسبز پہاڑوں پر سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ پڑی تھی۔ارضِ ہند سے عربوں کے تعلّق کی ابتدا حقیقتاً اِسی خطۂ زمین سے ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں نے سَواحلِ گجرات پر قدم رکھا، کوئی تعجب نہیں کہ کچھ صحابہ بھی یہاں آئے ہوں اور اِس سرزمین میں آسودۂ خواب ہوں۔ مؤرِّخِ شہیر حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ''یادِ ایام'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ تاریخی واقعہ ہے کہ، ۱۵ھ میں (یعنی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے رِحلت فرمانے کے صرف پانچ سال بعد) فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بحرین وعَمّان کی حکومت پر عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو نام زَد فرمایا، جن کا شمار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں تھا، اِنھوں نے عِنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ اپنے بھائی حَکَم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو بحرین کی حکومت پر نام زَد کر کے حُکم دیا کہ: وہ ہندوستان پر فوج کشی کریں، حَکَم رضی اللہ عنہ نے کشتیوں کے ذریعے سے دریائی سفر کی سخت منزلیں طے کیں، اور اپنی فوج کو لیے ہوئے سب سے پہلے سواحلِ گجرات پر قدم رکھا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ: ہندوستان کی سرزمین میں سب سے پہلے گجرات کو یہ شرف حاصل ہوا کہ، اُس خدائے یکتا پر ایمان لانے والوں کا اور اُسی ایک ہستی کو وَحدَہٗ لَاشَرِيكَ لَهٗ جاننے اور اُسی کو قادرِ مطلَق اور مُصرِّف الامور ماننے والوں کا پاک قدم پہلے اِسی سرزمین پر پڑا، اور اِسی سرزمین کے دَشت وجَبل ہندوستان میں سب سے پہلے اللہ أکبر کے نعروں سے گونجے۔ اِس حملے میں جن سعادت مندوں کو مرتبۂ شہادت نصیب ہوا اُن میں

غالبًا وہ اَنفاسِ قُدسیہ بھی تھے جنھوں نے حضرت رسول مقبول ﷺ کا جمالِ جہاں آرا دیکھا تھا، اور آپ ﷺ کی پاکیزہ صحبت اور رُوحانی تعلیم سے بھی مستفید ہو چکے تھے، اُن فدائیانِ اسلام کی قدسی صورتیں اِسی سرزمین کے آغوشِ محبت میں گنجِ بے رنج کی طرح مدفون ہوئیں، اگر چہ ہم کو اُس کنزِ مخفی کا پتہ نہیں ہے؛ مگر یہ یقینی ہے کہ، بمبئ اور بھروچ کے گردونواح میں یہ خزانہ سپردِ خاک ہوا ہوگا''۔ (یادِ ایام ص: ۴۴، ۴۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ علاقہ عربوں کی توجُّہ کا مرکز بن گیا تھا، ۱۵۹ھ میں عباسی خلیفہ نے یہاں جو فوج بھیجی تھی اُس میں ابوبکر رَبیع بن صَبیح بصریؒ بھی شامل تھے، وہ نہ صرف تابعی تھے؛ بلکہ حدیث کی پہلی کتاب اُنھوں نے ہی تیار کی تھی۔ اُن کے حلقۂ تلامذہ: امام سفیان ثوریؒ، امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، امام وکیع بن جرّاحؒ اور امام علی بن عاصم جیسے ائمۂ فن شامل تھے۔ اِس طرح گجرات میں علمِ حدیث کی داغ بیل ایسی مبارک ہستی کے ہاتھوں پڑی جن کے خرمنِ کمال کے خوشے میں اُس عہد کے مشاہیر علُما تھے۔ دہلی کا مرکزِ حدیث گجرات کے بہت بعد مَنصَّۂ شہود پر آیا، شیخ عبدالحق محدِّث دہلویؒ نے ابھی اپنی مسندِ درس نہیں بچھائی تھی کہ گجرات علمِ حدیث کا مرکز بن چکا تھا، صحیح بخاری کی دو شرحیں - جو غالبًا ہندوستان میں بخاری کی سب سے قدیم شرحیں ہیں - اِسی سرزمین پر لکھی گئی تھیں، یہاں علامہ شمس الدین سخاویؒ اور علامہ ابنِ حجر مکیؒ وغیرہ کے تلامذہ نے علمِ حدیث کی ترویج واشاعت میں اپنی زندگی گزار دی تھیں، یہاں کی درس گاہیں اور خانقاہیں ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ بیرونِ ہند سے تشنگانِ علم ومعرفت کو کھینچتی تھی، سولہویں اور سترہویں صدی میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دِینی اور ثقافتی زندگی کا مرکزِ ثقل گجرات کی طرف منتقل ہوگیا ہے، اور شاید ہی کوئی دینی یا علمی شعبہ ایسا ہو جس کے متبحِّر عالم یہاں موجود نہ ہوں۔ علمِ حدیث کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ یہاں فقہ میں بھی شاندار کارنامے انجام پائے تھے، روحانی

خانوادے بالخصوص: چشتیہ، سَہرِوَردِیہ، مغربیہ، شطّاریہ سلسلوں کی عظیم الشان خانقاہیں اور جماعت خانے یہاں قائم ہوئے، اور یہاں سے ملک کے دوسرے علاقوں میں اُن کے ذریعے سلسلوں کا دَورِتجدیدواِحیاء شروع ہوا۔ مؤرِّخوں نے گجرات کے اقتصادی خوش حالی، اُس کی عمارتوں کی خوب صورتی اور اُس کی صحت بخش آب وہوا کی تعریف کی ہے، اِس کی بندرگاہوں نے تمام ایشیائی ممالک سے رشتے قائم کرلیے تھے، ہندوستان کے حاجیوں کے قافلے اِسی سرزمین سے گزرتے تھے۔ (جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب)

اسلامی فتوحات سے قبل ہندوستان کے جس علاقے سے عرب سب سے زیادہ متعارَف تھے وہ گجرات تھا، عرب سیّاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے اِس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

مسعودی (م ۳۴۶ھ، ۹۵۷ء) " مروّج الذهب ومعادنُ الجوهر " میں گجرات کے راجہ "بلہرا" کے متعلّق لکھتا ہے: سندھ اور ہندوستان کے راجاؤں میں راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اَور کسی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے، اسلام اِس راجہ کی سلطنت میں محفوظ اور معزّز ہے، اُس کے ملک میں مسلمانوں کی نمازِ پنج گانہ کی مسجدیں اور جامع مسجدیں ہیں، جو آباد ہیں۔ گجرات کے راجہ نے عرب تاجروں کے لیے- جو ساحلی علاقوں میں بس گئے تھے- مسلمان قاضی مقرّر کیے تھے، جو "ہنرمن" کہلاتے تھے۔ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ، گجرات میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے سے پہلے مسلم آبادی اور اُس کے ثقافتی ادارے وُجود میں آگئے تھے۔ (ایضاً)

محترم سامعین! اِس شہر احمد آباد کی بنیاد سلطان احمد شاہ نے ڈالی، اِس کی تعمیر کا آغاز ذوالقعدہ ۸۱۳ھ میں اور تکمیل ۸۱۶ھ میں ہوئی۔ چار سو پچاس- اور ایک روایت کے مطابق پانچ سو- عالی شان مسجدیں بنائی تھیں، جو دُور دُور سے سنگِ خارا لاکر اُس کے ذریعے تعمیر کی گئی تھیں، یہاں کے مدارس، مساجد اور خانقاہیں پورے ملک میں شہرت رکھتی تھی۔ ابوالفضل

لکھتا ہے کہ: احمد آباد میں ایک ہزار مساجد ہیں جن کے مینار اور کتبے بے حد شان دار اور دِل کش ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ، احمد آباد کی زینت کا سبب اُس کی مساجد ہی تھیں، یہاں کے مدارس صدیوں تک تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے رہے، محمود شاہ اول کے زمانے میں یہاں متعدِّد ''مدارس بہشتِ آ گیں'' قائم کیے گئے تھے۔ حضرت مولانا وجیہ الدین علویؒ کا مدرسہ مدّتوں درس وتدریس کا مرکز رہا، اور ملک کے بڑے بڑے عالم یہاں علمی پیاس بجھانے کے لیے آتے رہے، اُن مدارس میں طَلَبا کو وظائف کثیر تعداد میں ملتے تھے، اور اُن کے کھانے اور رہنے کے لیے حیرت انگیز سہولتیں فراہم کی گئی تھیں، اِس سلسلے میں عثمان کا مدرسہ، خان سرور کا مدرسہ، سرخیز کا مدرسہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ہندوستان کی کوئی علمی تاریخ اِس کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ احمد آباد کا ''حوضِ قطب'' (جو اِس وقت کانکریہ کہلاتا ہے) ہندوستان کا سب سے بڑا حوض ہے۔

محترم حضرات! یہ تو گجرات اور احمد آباد کی تاریخِ ماضی کے چند اَوراق آپ کے سامنے پیش کیے، اِس وقت صوبہ گجرات کے مختلف حصوں میں بحمد اللہ تعالیٰ بڑے علمی ودینی مدارس اور ادارے موجود ہیں؛ البتہ شہر احمد آباد میں مدتوں کے جُمود وتعطُّل کے بعد پچھلے چند سالوں سے پھر علمی ادارے وجود میں آرہے ہیں، جن میں سے ایک ''مدرسہ عربیہ اسلامیہ جوہاپورہ'' ہے، جس کے صحن میں اِس وقت ہم اور آپ جمع ہیں۔ یہ نومولود ادارہ پچھلے ڈھائی سال سے وُجود میں آیا ہے، اور بحمد اللہ تعالیٰ صُوری ومعنوی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، اور اپنی علمی ودینی خدمات کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام بنا رہا ہے۔ اِس کے عِلاوہ دوسرا جامعہ ''فیضان القرآن پترے والی مسجد'' ہے، جہاں مجلسِ استقبالیہ کا دفتر قائم ہوکر اجلاسِ ہٰذا کی پیشگی تیاریوں میں مصروف رہا، جس کی بنیاد ایک ولی صفت بزرگ حضرت مولانا فضل احمد صاحب دامت برکاتہم نے ڈالی، جس کی ۲۶/شاخیں شہر احمد آباد میں قرآنِ

پاک کی خدمت میں مصروف ہیں، اور خود جامعہ فیضان القرآن میں ۳۲۵ ر طلبہ مقیم ہیں، جن کو حفظ وناظرہ، تجوید اور فارسی کی معیاری تعلیم دی جارہی ہے، اور پچھلے سالوں میں ۸۰ ر حُفَّاظِ کرام قوم کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔

بزرگانِ محترم! ہمارا فرض ہے کہ ماضی کے تجربوں سے مستقبل کے لیے سبق لیں، اور حال کے سرمایے سے استقبال کے لیے توشہ فراہم کریں، ہم اِس آزاد مملکت میں باعزت شہری بن کر رہیں یا پس ماندہ، از پا اُفتادہ، خود فراموش ومعاذ اللہ خدا فراموش بن کر زندگی گزاریں، یہ ہمارے فکرِ صحیح، بیدار مغزی اور ہمارے عمل وکردار پر موقوف ہے۔ کوئی بھی صحیح الحواس پس ماندگی کو پسند نہیں کرسکتا، ہر ایک سلیمُ الفطرت پس ماندگی کی ذلّت کو موت سے بدتر سمجھتا ہے؛ مگر محترم حضرات! جب تک سعیِ پیہم اور جِدّ وجُہد کی روشنی نمایاں نہ ہو پس ماندگی کی تاریکی کو چھانٹا نہیں جاسکتا، پس ماندگی ظلمت وتاریکی ہے اور جِدّ وجُہد نور اور روشنی، جب بھی کوشش اور سعیِ پیہم کی روشنی دھیمی پڑتی ہے پس ماندگی کی تاریکی اُبھر آتی ہے۔ آپ اگر پس ماندگی کی تاریکی ختم کرنا چاہتے ہیں تو صراطِ مستقیم پر جِدّ وجُہد کی روشنی تیز کر دیجیے، دنیا کا کام ہو یا دِین کا، اجتماعی ہو یا انفرادی؛ ہر ایک کے لیے قانونِ قدرت یہی ہے: ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ﴾ (انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اپنی کوشش سے حاصل کرے)۔ آج کے اِس اجتماع میں ہمارے غور وفکر کا بنیادی نقطہ یہی ہونا چاہیے کہ، ہمارا عمل اور کردار کیا ہو؟ دِینی لحاظ سے جو پستی ہم میں ہے، یا دنیاوی پس ماندگی جو موجود ہے یا جس کے دامن گیر ہونے کا خطرہ ہے، اُس کے دفع کرنے کی تدبیریں کیاں ہوں؟ قوتِ عمل کس طرح متحرّک ہو اور جذباتِ خوابیدہ کس طرح بیدار ہوں؟۔

محترم حضرات! ہمارے ملک کا دستور جمہوری اور سیکولر ہے، اِس میں اپنے علوم، اپنے مذہب، اپنی روایات، اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کی حفاظت ہمارا حق ہے اور ہمارا فرض

بھی، اور اِس فریضے کو ہمیں ہی انجام دینا ہے، سیکولر جمہوریہ کا امانت دارانہ فریضہ یہ ہے کہ وہ ہماری کوشش میں رُکاوٹ نہ ڈالے۔

اِفتراق اور فرقہ وارانہ مُنافرت جو آج پائی جارہی ہے، یہ اُن زہریلے جراثیم کا نتیجہ ہے جو انگریز نے خاص قِسم کی تعلیم اور ڈپلومیسی سے ہندو اور مسلمانوں کے دماغوں میں پیوست کیے تھے۔ پنجاب ایگزکٹو کونسل کے بہت پُرانے ممبر ''سرجان مینارڈ'' نے خود اقرار کیا تھا کہ: ''شجرِ علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی اِفتراق کا احساس نہ تھا''۔ نیز یہ کہ: ''ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی''۔ (اِن ہیپی انڈیا، لالہ لاجپت رائے)

انگریز سے پہلے کے ہندوستان پر بھی ایک نظر ڈالیے:

سترہویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح ایلگزانڈر ہملٹن نے سندھ کے پُرانے شہر ''ٹھٹھ'' کے متعلّق لکھا تھا کہ:

''یہاں ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے؛ لیکن ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رَواداری پورے طور سے بَرتی جاتی ہے، وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اُسی طرح مناتے ہیں جس طرح پہلے زمانے میں مناتے تھے، جب کہ راج خود ہندوؤں کا تھا''۔

آگے چل کر لکھا ہے:

''صرف بنیوں کے ۸۵؍ فرقے ہیں، اور اگرچہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے؛ لیکن آپس میں مل جُل کر رہتے ہیں، پارسی بھی ہیں، اور وہ اپنے رسوم مذہبِ زردشت کے بہ موجَب ادا کرتے ہیں، عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ وہ گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں'' الخ۔

مختصر یہ کہ فرقہ واریت -جس کا رَقصِ برہنہ آج ہر اَمن پسند شہری اور ملک کے ہر ایک خیر خواہ کو پریشان کیے ہوئے ہے- ہندوستانیوں کی فطرت نہیں ہے؛ بلکہ ایک سکھایا ہوا

سبق ہے جو فراموش بھی ہوسکتا ہے، بہ شرطے کہ تعلیم گاہیں - جہاں یہ سبق سب سے پہلے پڑھایا گیا تھا - اپنی اصلاح کے لیے آمادہ ہوں، اور کم از کم غلط تاریخوں کی تصحیح کرلیں۔

کوئی شک نہیں کہ، گلشنِ وطن کو فرقہ واریت کے کانٹوں سے صاف کرکے انسانی بھائی چارے کی ہموار سطح تیار کرنا تمام اہلِ وطن کا مشترک فرض ہے؛ مگر یہ مشترک فرض مسلمان کا مخصوص فرض ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ محض باشندۂ ملک کی حیثیت سے نہیں؛ بلکہ اِس حیثیت سے بھی کہ وہ اُس ذاتِ اقدس کا دامن سنبھالے ہوئے ہے جن کو مَکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے تمام جہانوں کے واسطے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا، ایک مسلمان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اُن اِصلاحات کا عَلَم بَردار ہو۔

محترم سامعینِ کرام! کسی مسلمان کے لیے اِس میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ، اسلام کا مستقبل روشن ہے؛ کیوں کہ اسلام کسی خاص قوم کا کلچر نہیں؛ بلکہ وہ ایسے ہمہ گیر اُصول کا نام ہے جن کو فطرتِ سلیم اُس وقت سے تسلیم کیے ہوئے جب سے انسان نے خدا شناسی اور معرفتِ الٰہی کو نصبُ العین اور دِین داری و مذہبیت کو وظیفۂ عمل بنایا۔ إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ.

موجودہ دنیا لفظِ اسلام سے خواہ کتنا ہی گُریز کرے؛ مگر اسلام کے اصول ونظریات غیر شعوری طور پر اختیار کرتی جارہی ہے، اور جیسے فلسفہ اور سائنس کی موشِگافیاں حقیقت سے قریب ہوتی جائیں گی اِن اصول کی صداقت وحَقَّانیت نکھرتی جائے گی، اور حقیقت پسند انسانوں کی گردنیں اِس کے تسلیم کرنے کے لیے جھکتی جائیں گی۔ اِن اصولوں کو منوانے کے لیے نہ کبھی قوت وحَشمت اور تیغ وسِنان کی ضرورت پڑی، نہ آج ضرورت ہے، نور کو نور اور روشنی کو روشنی تسلیم کرنے کے لیے صرف چشمِ بینا کی ضرورت ہے، اور اِتنا انصاف درکار ہے جو ''روزِ روشن'' کو ''شبِ تار'' کہنے کی اجازت نہ دے سکے؛ البتہ ایک بات یاد رہے کہ،

اسلام کا مستقبل اگر روشن ہے تو یہ ضروری نہیں کہ، ہم جیسے بدنام کنندگانِ اسلام کا مستقبل بھی روشن ہو، ہم اگر اپنا مستقبل روشن بنانا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وابستہ ہوں، داعیٔ اسلام حضرت مُـحَـمَّـدٌ رَّسُوْلُ اللّٰـهِ ﷺ کے دامنِ رحمت کو زیادہ مضبوطی سے سنبھالیں۔ ﴿وَأَنْتُـمُ الأَعْـلَـوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (تم ہی سر بلند ہو گے بہ شرطے کہ صاحبِ ایمان ہو)۔

یہود ونصاریٰ کو اُن کے اِس تصوُّر نے برباد کیا کہ: وہ خواہ کچھ ہوں، اُن کے اَخلاق واَطوار خواہ کیسے ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اُس کے لڑکے بالے ہیں ﴿نَحْـنُ أَبْـنَـاءُ اللّٰـهِ وَأَحِبَّاؤُهُ﴾؛ مگر کتابُ اللہ نے بِلا کسی لاگ لپیٹ کے نہایت صفائی سے اعلان فرمایا: ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ فَأُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰـلِـدُوْنَ﴾ (کیوں نہیں! جو بُرائی کا مُرتکب ہوا اور اُس کے گناہ اُس کو گھیر لیں، تو وہ دوزخ والے ہیں، ہمیشہ اُسی آگ میں رہیں گے) یعنی رنگ ونسل، قبیلہ اور خاندان کا کوئی امتیاز نہیں، امتیاز اخلاق وکردار کا ہے، اسلام کا جامہ پہن کر اگر ایمان واسلام کی حقیقت بھی اختیار کرتے ہو تو بے شک سر بلندی تمھارا حصہ ہے؛ ورنہ اللہ کو اپنے دینِ حق کے لیے تمھاری حاجت نہیں ﴿إِنْ تَتَـوَلَّـوْا يَسْتَبْـدِلْ قَـوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَايَكُوْنُوْا أَمْثَالَكُمْ﴾ (اگر تم نے منھ موڑا تو اللہ تعالیٰ تمھارے سِوا کوئی دوسری قوم بدل دے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے)۔

حفاظتِ اسلام کے نعرے بہت کچھ بلند کیے جاتے ہیں؛ مگر اُس کے عملی پہلو سے ہم خود گُریزاں رہتے ہیں، اسلام کوئی مُجسَّمہ نہیں جس کی حفاظت کے لیے لاؤلشکر کی ضرورت ہو، آپ اپنے اندر اسلام کو سَمو لیجیے، آپ بھی محفوظ ہوجائیں گے اور اسلام بھی محفوظ ہوجائے گا، عمل سے گریز اور زبان پر دعوے! معـاذ الله! ﴿كَبُـرَ مَـقْتـاً عِـنْـدَ اللّٰهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴾۔

محترم سامعین! شمع جہاں بھی ہو پروانے خود بہ خود قربان ہونے کے لیے دوڑتے ہیں، نہ لالچ دِلانے کی ضرورتی ہے نہ ڈرانے دھمکانے کی، صرف فطرت کی سلامتی درکار ہوتی ہے، اور یہ کہ نورِ شمع بے حجاب ہو۔ بد قسمتی سے آج ہمارے اعمال واخلاق شمعِ اسلام کے لیے حجاب بنے ہوئے ہیں، ہم اپنے اعمال واخلاق کو نورِ ایمان کا آئینہ دار بنالیں، پروانے خود بہ خود لپکیں گے۔

آج اِسی مقصد کے لیے ہندوستان کی مِلّتِ اسلامیہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے اسٹیج پر متحِد ہوئی ہے، اور دِین وملّت کے قائدین ورہنماؤں کا یہ کارواں زَین البلاد احمد آباد میں وارد ہوا ہے، مسلمانانِ گجرات واحمد آباد اپنے اِن اکابرین کو''خوش آمدید'' کہتے ہوئے فخر ومسرت محسوس کرتے ہیں، ہم اِس اجتماع کو- جس نے اُمتِ مسلمہ میں اِتّحاد کی ایک لہر پھونک دی ہے- اُمّت کے لیے فالِ نیک سمجھتے ہیں۔

گذشتہ دنوں ہندوستان کی عدالتِ عالیہ نے''یونیفارم سِول کوڈ'' کے نِفاذ کے لیے حکومتِ وقت کو اُبھار کر پھر سے اِس مسئلے کو ہوا دی ہے۔

اِس وقت اولین فرصت میں یہ ضروری ہے کہ، اِس ملک میں بسنے والے تمام مسلمان عزمِ مصمّم کرلیں کہ: ہم اِن حالات کا مقابلہ کریں گے، اِس کے لیے آپسی اختلافات کو پسِ پُشت ڈال کر متّفق ومُتّحد ہوکر بورڈ کے پلیٹ فارم سے جمہوری طریقے اپنا کر اُس کا مقابلہ کریں، یہ ضروری ہے۔ ہم جلسے جلوس اور نعرہ بازی کو کافی سمجھ رہے ہیں، اور ایسا سمجھ رہے ہیں کہ بڑے بڑے اجلاسات میں حکومت کے خلاف اپنے جذبات کے جوشیلے اظہار سے مسائل حل ہوجائیں گے، اور ہم مذہب کی حفاظت کے بار سے سبک دوش ہوجائیں گے، یہ اندازِ فکر غیر مفید ہونے کے ساتھ ساتھ مِلّی وجود کے لیے بھی مُہلِک ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ ہم پیچیدہ مسائل کے بارے میں جلد بازی کے عادی ہوچکے ہیں، کسی بھی مسئلے کی بنیاد

کیا ہے؟ وہ کون سی کمی ہے جہاں سے یہ اُبھرا ہے؟ اِس کی تحقیق اور پھر اُس کے ازالے کی تدبیر کی طرف ہم بہت کم توجّہ کرتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ، قوموں کا عروج وزوال اُن کے اپنے حالات پر موقوف ہے، کوئی بھی حکومت کسی قوم کو ہلاک نہیں کرسکتی جب تک کہ خود اُس نے اپنی تباہی کا سامان مُہیّا نہ کیا ہو۔

بڑے افسوس کا مقام ہے، کہ ہم اپنی زندگیوں پر نظر نہیں کررہے ہیں، کہ ہم روزانہ کتنے اسلامی اُصول توڑ رہے ہیں؟ ہم خود کو اور مُعاشرے کو کتنا بگاڑ رہے ہیں؟ ہم میں قدم قدم پر خرابیاں موجود ہیں، ضرورت تھی کہ ہم دوسروں کو کچھ کہنے کے بہ جائے اپنے گھر کی خبر لیتے، اپنی اصلاح کرتے، مُعاشرے کو صحیح لائن پر لانے کی سعی کرتے، اور جو لوگ ہمارے دِین ومذہب میں دَخل اندازی کررہے ہیں اُن کے ساتھ پورے یقین اور بھرپور اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے، ہم اپنے اعلیٰ اخلاق اور اسلامی مُعاشرے کی قوتِ عمل سے اُن کا منھ بند کردیتے۔ آج ملّتِ اسلامیہ ''پرسنل لا'' کی نسبت سے پیدا شدہ بیداری سے فائدہ اُٹھا کر اصلاحِ مُعاشرہ کی تحریک شروع کردے، اِس جوش کا رُخ مَنفی سَمت سے ہٹا کر مُثبَت سَمت کی طرف کردیں، اور شہر شہر، قریہ قریہ، محلّہ محلّہ؛ ہر مسلم گھرانے میں اسلامی تعلیمات صحیح انداز میں پیش کی جائیں، اور اسلام کی خوبیوں کو اُجاگر کیا جائے، اور ہر فرد کو آمادہ کیا جائے کہ آج ہی سے وہ اپنی پوری زندگی اسلامی ہدایت کے مطابق گزارے گا۔ اگر ہم نے یہ کرلیا تو مجھے یقین ہے کہ، آج جو لوگ اسلام اور قرآن کے دشمن ہیں کل وہ اسلام کو اپنانے پر مجبور ہوں گے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا مُحافِظ صرف اللہ تعالیٰ ہے، اُسی کے ہاتھ میں عزت وذلّت ہے، محدُود وقت کے لیے کرسیٔ اِقتدار پر قابض لوگوں کے سامنے اپنے مسائل پیش کرکے ہم کسی حال میں مطمئن نہیں ہوسکتے۔ بالفرض اگر وہ ہم سے خوش بھی ہوگئے اور ہمارے مطالَبات منظور بھی کرلیے؛ لیکن ہم اپنے مُعاشرے کو اسلامی سانچے میں نہ ڈھال

سکے،تو کیا ہمیں ملا ہوا اِقتدار کا یہ سہارا ہمارے لیے کار آمد ہوگا؟ اور کیا اللہ تعالیٰ اور اُس کے پاک رسول ﷺ کی طرف سے ہم پر ڈالا گیا فریضہ ختم ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اِس کا جواب نفی میں ہے،تو ہم اپنی تمام توانایاں حکومت سے ٹکّر لینے میں کیوں صَرف کریں! حکومت کو اپنے نظریے سے آگاہ کر دینے کے بعد ہمیں اپنا رُخ اپنے بھائیوں کی اصلاح کی طرف کیوں نہیں موڑنا چاہیے؟ اگر ہم نے خود شریعت کی حفاظت نہ کی، اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کا خود فکر نہ کیا،تو غیروں سے شریعت وعزت کی حفاظت کا مطالبہ کیوں !!!۔

آخر میں مکرّر ہدیۂ تشکُّر واِمتنان خدماتِ عالیہ میں پیش کرتا ہوں، کہ آپ نے قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی، اور ہمیں خدمت کا موقع دیا، اِس سلسلے میں اگر کوتاہی بھی ہو جائے تو درگزر کا معاملہ فرمائیں۔ ساتھ ہی شہر احمد آباد کی مختلف برادریوں، مختلف تنظیموں کے خصوصاً اور مسلمانانِ گجرات کے عموماً ہم شکر گزار ہیں، جنھوں نے دامے، درمے، قدمے، سُخنے اِس اجلاس کو ہر پہلو سے کامیاب بنانے میں اپنا ممکنہ اور پُرخلوص تعاون دیا۔فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ خَيْراً.

ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہیں کہ: وہ تحفُّظِ شریعت کی اِس مقدّس تحریک کو نظرِ بد سے بچا کر اِس اجلاس کو ہر پہلو سے کامیاب بنائے۔ (آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِينَ)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ،وَالصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ عَلىٰ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ، مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الأَمِيْن، وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.